www.pakcity.org www.pakcity.org www.pakcity.org

میر تقی میر (غزل نمبر 1)

مشکل الفاظ و تراکیب کی تفہیم

الفاظ	مفہوم
مند جانا	بند ہو جانا
واہونا	کُھلنا
نوحہ گری	رونا پیٹنا
غرور	تکبر
داورِ محشر	حشر کے دن انصاف کرنے والا
بے دادگری	ظلم و ستم، ناانصافی
شیشہ گری	شیشہ بنانے کا ہنر
ٹک	ذرا
جگر سوختہ	جلا ہوا دل، دل جلا
شِعار	طریقہ، چلن
شش جہت	چھے اطراف، مراد ہے ساری دنیا۔ چھے اطراف اس طرح بنتی ہیں: دائیں، بائیں، آگے، پیچھے، اوپر، نیچے
دوچار ہونا	ملاقات ہونا، آمنا سامنا ہونا

شعر نمبر 1:

جس سر کو غرور آج ہے یاں تاجوری کا
کل اُس پہ یہیں شور ہے پھر نوحہ گری کا

تشریح: خدائے سخن میر تقی میر اردو کے شہرۂ آفاق غزل گو شاعر تھے۔ غمِ دوراں اور غمِ جاناں پر مبنی میرؔ کے اشعار زندگی کی تلخیوں کے ترجمان بھی ہیں اور حقیقتوں کے عکاس بھی۔

زیرِ تشریح شعر میں میرؔ کہتے ہیں کہ ''ہر وہ شخص جسے اپنے اختیار اور اقتدار پر غرور ہے، اُسے آخر کار منوں مٹی تلے دفن ہو جانا ہے۔''

اقتدار اور اختیار ایک ایسی شے ہے کہ جسے حاصل ہو جائے عام طور پر وہ اپنے آپ کو دوسری مخلوق سے برتر سمجھنے لگتا ہے۔ عام لوگوں کو حقیر اور گھٹیا سمجھتا ہے اور ظاہری جاہ و جلال کے بل بوتے پر یہ خیال کرتا ہے کہ شاید اُسے ہمیشہ یہاں رہنا ہے اور یہ اقتدار بھی اُس کے پاس ہمیشہ باقی رہنے والا ہے۔ وہ دنیا کی یہ بڑی حقیقت بھول جاتا ہے کہ کائنات کی ہر چیز کی طرح اقتدار اور یہ شان و شوکت سب کچھ فانی ہے۔ قرآن میں ربِ کائنات نے یہ اصول بیان فرمایا ہے:

www.pakcity.org www.pakcity.org

www.pakcity.org www.pakcity.org www.pakcity.org

تلک الایام نداولھا بین الناس o ''یہ دن ہم لوگوں پر بدلتے ہیں۔''

دن اور حالات بدلتے دیر نہیں لگتی۔ ہر کمال کو زوال ہوتا ہے۔ ہر شے عارضی اور ناپائیدار ہے۔ ہر شے فانی ہے۔ یہ دنیا چند روزہ ہے۔ جو اس دنیا میں آیا ہے اسے آخر کار یہاں سے رخصت ہو جانا ہے۔ موت ایک ایسی حقیقت ہے کہ جس سے انکار ممکن نہیں ہے۔ ارشادِ ربانی ہے کہ:

کل نفسٍ ذائقة الموت ''ہر نفس نے موت کا ذائقہ چکھنا ہے''۔

چناں چہ موت آتے ہی صاحبِ اقتدار سے عہدہ، شان و شوکت اور اقتدار سب چھن جاتا ہے اور بڑے بڑے بادشاہ خاک میں مل جاتے ہیں۔ آتش کا کہنا ہے:

نہ گورِ سکندرؔ نہ ہے قبرِ دارا
مٹے ناموں کے نشاں کیسے کیسے

درحقیقت میر تقی میرؔ کا دور مغلیہ سلطنت کے زوال کا دور تھا۔ میرؔ نے اپنی آنکھوں سے کئی بادشاہوں کی حکومتوں کے تختے اُلٹتے دیکھے، بادشاہوں کو سولی پر چڑھتے دیکھا اور اُن کی آنکھوں میں سلائیاں پھرتی دیکھیں۔ ایک طرف نیا بادشاہ بادشاہت کا جشن مناتا تھا تو دوسری طرف سابقہ بادشاہ کی میت پر نوحہ خوانی ہوتی تھی۔ وہ بادشاہ جو ایک دن پہلے دماغ میں بادشاہت کا غرور رکھتے تھے اگلے ہی دن وہ ماضی کا حصہ بن جاتے تھے۔ آتشؔ کا کہنا ہے:

مدفوں ہیں اس زمیں میں ہزاروں ہی تاجور
بجھتا ہے تختِ شاہ سرِ بادشاہ پر

''تاجوری'' دراصل بادشاہت، طاقت، عہدے اور شان و شوکت کی علامت ہے۔ اسی طرح ''نوحہ گری'' بے بسی، بے کسی اور عاجزی کی علامت ہے۔ میر تقی میرؔ کا موقف یہ ہے کہ ہر چیز کی طرح بادشاہت عارضی ہے چناں چہ ایک فانی چیز پر غرور و تکبر بے کار چیز ہے۔ غرور کا سر ہمیشہ نیچا ہوتا ہے۔ اگر انسان کو کوئی نعمت میسر آتی ہے تو اُسے چاہیے کہ بجائے غرور و تکبر کے اپنے اندر عجز و انکسار پیدا کرے کیوں کہ عہدے اور شان و شوکت سب کچھ عارضی ہے۔ انسان کے مرتے ہی سب کچھ ختم ہو جاتا ہے۔ جوشؔ ملیح آبادی کا کہنا ہے:

کل تجھ میں بھرا تھا جو غرور آج کدھر ہے؟
اے کاسۂ سر! بول ترا تاج کدھر ہے؟

بقول میرؔ:

اے حبِ جاہ والو! جو آج تاج ور ہے
کل اُس کو دیکھیو تم، نے تاج ہے نہ سر ہے

شعر نمبر 2:

آفاق کی منزل سے گیا کون سلامت
اسباب لٹا راہ میں یاں ہر سفری کا

تشریح: خدائے سخن میر تقی میرؔ اردو کے شہرۂ آفاق غزل گو شاعر تھے۔ غمِ دوراں اور غمِ جاناں پر مبنی میرؔ کے اشعار زندگی کی تلخیوں کے ترجمان بھی ہیں اور حقیقتوں کے عکاس بھی۔

زیرِ تشریح شعر میں میرؔ کہتے ہیں کہ ''دنیا کے مسافر خانے سے کوئی مسافر سلامت نہیں جاتا بلکہ ہر مسافر کا مال و اسباب راستے ہی میں

www.pakcity.org www.pakcity.org

www.pakcity.org www.pakcity.org www.pakcity.org

لُٹ جاتا ہے۔"

دنیا ایک مسافر خانہ ہے اور اس مسافر خانے میں انسان کی حیثیت ایک مسافر کی طرح ہے۔ کسی بھی منزل کی جانب سفر سے پہلے انسان زادِ سفر ہمراہ لیتا ہے۔ انسان کو دورانِ سفر اسباب کے لٹنے کا خطرہ بھی ہوتا ہے۔ اس طرح زندگی بھی ایک سفر ہے جسے طے کرنے والا ہر مسافر (انسان) کہیں نہ کہیں ضرور نقصان اٹھاتا ہے۔ دنیا میں جو شخص بھی آیا ہے وہ صحیح سلامت یہاں سے واپس نہیں جا سکا بلکہ لٹنا اُس کا مقدر ہے۔ میرؔ کا کہنا ہے:

مقامِ خانۂ آفاق وہ ہے
کہ جو آیا ہے یاں کچھ کھو گیا ہے

انسان کے لٹنے سے مراد مختلف نوعیت کی پریشانیاں اور تکالیف بھی ہو سکتی ہیں جو انسان کو اس دنیا میں اٹھانا پڑتی ہیں۔ بقول مہاتما بدھ "ہم سب اپنے اپنے حصے کے دکھ جھیلنے کے لیے اس دنیا میں آتے ہیں"۔ زندگی کے سفر میں انسان بے فکری اور سکون کی دولت سے مالا مال ہو کر قدم رکھتا ہے لیکن دورانِ سفر اسے ایسی تکلیفیں برداشت کرنی پڑتی ہیں جس کی وجہ سے وہ سکون، بے فکری، ہوش و حواس اور تاب و توان کی دولت سے محروم ہو جاتا ہے۔ یعنی انسان کے پاس سکون، بے فکری، ہوش و حواس اور طاقت ایسے اسباب ہیں جو دُنیا ہی میں انسان سے چھن جاتے ہیں۔ داغؔ کا کہنا ہے:

ہوش و حواس و تاب و تواں، داغؔ! جا چکے
اب ہم بھی جانے والے ہیں سامان تو گیا

مال و اسباب کے لٹنے کا ایک پہلو یہ بھی ہو سکتا ہے کہ انسان جب اس دنیا میں آتا ہے تو اس کے پاس معصومیت کا زیور ہوتا ہے۔ اس دنیا میں زندگی بسر کرتے ہوئے انسان اس معصومیت سے محروم ہو جاتا ہے۔ خدا نے دنیا کو کئی پُرکشش چیزوں سے مزین اور خوب صورت بنایا ہے۔ یہاں کی رنگینیاں اور رعنائیاں انسان کو اپنی طرف مائل کرتی ہیں۔ جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسان دنیا کی رنگینیوں میں ڈوب کر اپنی فطری معصومیت کھو بیٹھتا ہے۔ حضور ﷺ کا ارشاد مبارک ہے کہ: "پیدا ہونے والا ہر بچہ فطرت (اسلام) پر پیدا ہوتا ہے۔" معلوم ہوا کہ انسان دنیا میں آتا تو معصوم ہے لیکن دنیا کی رعنائیوں میں وہ اپنی معصومیت سے ہاتھ دھو بیٹھتا ہے اور گناہوں کا بوجھ اپنے سر پر دھر لیتا ہے۔ میر درد کا کہنا ہے:

اس جہان میں آ کے ہم کیا کر چلے
بارِ عصیاں سر پہ اپنے دھر چلے

میرؔ کا موقف ہے کہ دنیا ایک ایسا مسافر خانہ ہے جہاں کسی مسافر (انسان) کا اسباب سلامت نہیں رہ سکتا بلکہ دورانِ سفر ہی لوٹ لیا جاتا ہے۔ دردؔ کا کہنا ہے:

دل زمانے کے ہاتھ سے سالم
کوئی ہوگا کہ رہ گیا ہوگا؟

شعر نمبر 3:

ہر زخمِ جگر داور محشر سے ہمارا
انصاف طلب ہے تیری بے داد گری کا

www.pakcity.org www.pakcity.org

www.pakcity.org www.pakcity.org www.pakcity.org

تشریح: خدائے سخن میر تقی میرؔ اردو کے شہرۂ آفاق غزل گو شاعر تھے۔ غمِ دوراں اور غمِ جاناں پر مبنی میرؔ کے اشعار زندگی کی تلخیوں کے ترجمان بھی ہیں اور حقیقتوں کے عکاس بھی۔

زیرِ تشریح شعر میں میرؔ کہتے ہیں کہ ''ہمارے جگر کا ہر زخم حشر کے مالک (اللہ تعالیٰ) سے تیرے ظلم و ستم کا انصاف مانگے گا۔''

اردو کی کلاسیکی غزل میں محبوب کے ظلم و ستم اور محبت کرنے والوں کے دُکھوں اور تکلیفوں کا ذکر کثرت سے کیا جاتا ہے۔ عاشق محبوب پر جان نثار کرتا ہے۔ چاہت، وفاداری اور خلوص سے محبوب کی خوشنودی حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس کے برعکس محبوب انتہائی سنگدل، ظالم اور بے وفا ہوتا ہے۔ وہ عاشق پر طرح طرح کے ظلم کرتا ہے۔ محبوب کے ظلم و ستم اور عشق کے دُکھ عاشق کا کلیجہ چھلنی چھلنی اور اُس کا جگر زخمی کرتے رہتے ہیں۔ مگر عاشق تسلیم و رضا کے شیوے سے یہ سارے ظلم و ستم برداشت کرتا ہے۔ میرؔ کا کہنا ہے:

جو جو ظلم کیے ہیں تم نے، سو سو ہم نے اُٹھائے ہیں
داغ جگر پہ جلائے ہیں، چھاتی پہ جراحت کھائے ہیں

میرؔ محبوب سے مخاطب ہیں کہ ہم تو تمھارے ظلم برداشت کرتے رہے اور ہماری زبان پر کوئی حرفِ شکایت نہیں آیا۔ لیکن قیامت کے دربار میں ہمارے جگر کے زخم خاموش نہ رہ سکیں گے بلکہ ہمیں لگنے والا ہر زخم ''مالک یوم الدین'' سے انصاف مانگے گا۔ دراصل ظلم کسی بھی نوعیت کا ہو ناپسندیدہ ہوتا ہے۔ ظلم کے خلاف پہلا ردِ عمل تو یہ ہوتا ہے کہ مظلوم خود بدلہ لینے کی خواہش رکھتا ہے اگر وہ کمزور ہو تو معاشرے میں موجود عدل و انصاف کے اداروں سے انصاف کا طلب گار ہوتا ہے اگر وہاں بھی انصاف میسر نہ ہو تو بالآخر یوم حساب کے مالک کی طرف رجوع کرتا ہے اور داورِ روزِ قیامت (خدا) کے سامنے اپنا زخمی کلیجہ رکھتا ہے۔ داغؔ کا کہنا ہے:

داورِ روزِ قیامت دیکھ لے
اس کلیجہ پر لگا ہے تیر عشق

تشریح طلب شعر میں بے دادگر کا تعین نہیں۔ وہ کوئی معاشرتی قوت بھی ہو سکتی ہے اور محبوب بھی۔ کیوں کہ محبت ایک ایسا تجربہ ہے جس کے بارے میں جس کسی نے بھی اپنی رائے کا اظہار کیا ہے یہی کہا ہے کہ یہ آسان کام نہیں ہے۔ ایک مشکل اور مصیبتوں سے بھرا راستہ ہے۔ جہاں محبوب اور معاشرے کے ہاتھوں بہت سے زخم کھانے پڑتے ہیں۔ دنیا میں تو عاشق خاموش ہے لیکن حشر کے میدان میں وہ ان مظالم کی شکایت خدا سے کرے گا اور حشر کے میدان میں عاشق کے شکوے محبوب کے لیے وبالِ جان بن جائیں گے۔ داغؔ کا کہنا ہے:

بڑا مزہ ہو جو حشر میں ہم کریں شکوہ
وہ منتوں سے کہیں 'چپ رہو خدا کے لیے

تشریح طلب شعر میں میر تقی میرؔ کا موقف یہ ہے کہ محبت میں ہمیں جو دکھ ملے وہ لا دوا تھے۔ جیتے جی تو ان دکھوں کا مداوا نہیں ہو سکا اب میدان حشر میں محبت میں ملنے والا ہر زخم اللہ تعالیٰ سے انصاف مانگ رہا ہے کہ محبوب نے ہمارے ساتھ جو برتاؤ کیا مالک یوم حساب ہی وہ حساب چکا سکتا ہے۔ محبوب کو آج ظلم سے باز رہنا چاہیے ورنہ کل روزِ قیامت وہ ظالم خود اللہ سے رحم کی درخواست کرے گا۔ داغؔ کا کہنا ہے:

کل تمھیں داورِ محشر سے یہ کہنا ہوگا
رحم کر رحم محبت کے گناہ گاروں پر

شعر نمبر 4:

لے سانس بھی آہستہ کہ نازک ہے بہت کام
آفاق کی اس کارگہِ شیشہ گری کا

www.pakcity.org www.pakcity.org

www.pakcity.org www.pakcity.org www.pakcity.org

تشریح: خدائے سخن میر تقی میرؔ اردو کے شہرۂ آفاق غزل گو شاعر تھے۔ غمِ دوراں اور غمِ جاناں پر مبنی میرؔ کے اشعار زندگی کی تلخیوں کے ترجمان بھی ہیں اور حقیقتوں کے عکاس بھی۔

زیرِ تشریح شعر میں میرؔ کہتے ہیں کہ ''دنیا میں انتہائی احتیاط سے زندگی بسر کرنی چاہیے کیوں کہ دُنیا کا کارخانہ شیشہ کے کام کی طرح بہت نازک ہے۔''

مشہور مقولہ ہے ''لمحوں کی خطا صدیوں کی سزا بن جاتی ہے۔'' اس دنیا میں انتہائی احتیاط کے ساتھ زندگی بسر کرنا چاہیے۔ انسان کی معمولی سی غلطی اس کی نیک نامی اور عاقبت خراب کر دیتی ہے۔ لہٰذا انسان کو دنیا میں ہر قدم پھونک پھونک کر رکھنا چاہیے کیوں کہ دنیا میں ہر طرف برائیاں پھیلی ہوئی ہیں اور اس پرفتن جہان میں انسان کو اپنا دامن برائیوں اور غلط راستوں سے بچانا چاہیے۔ ایک صحابی ﷺ نے تقویٰ کا مفہوم اس مثال سے سمجھایا کہ راستے کے دائیں بائیں اگر کانٹے ہی کانٹے ہوں تو انسان اس راستے پر اپنے کپڑے اور بدن بچاتا ہوا چلتا ہے۔ یہی حقیقت تقویٰ کی ہے کہ انسان کو دنیا میں ہر طرف پھیلی برائیوں سے دامن بچاتے ہوئے زندگی بسر کرنی چاہیے کیوں کہ دنیاداری کا کام بہت نازک ہے۔ میرؔ کا کہنا ہے:

؎ میرؔ صاحب! زمانہ نازک ہے
دونوں ہاتھوں سے تھامیے دستار

زمانے کی نزاکت کو سمجھانے کے لیے میرؔ نے دنیا کے اس کارخانے کو شیشہ سازی کے کام سے تشبیہ دی ہے۔ شیشے کی مصنوعات بنانے کے کارخانے میں انتہائی احتیاط کی ضرورت ہوتی ہے۔ پرانے زمانے میں جب شیشے کی چیزیں بنائی جاتی تھیں تو پگھلے ہوئے شیشے کو پھونکنی کی مدد سے خاص شکل وصورت دی جاتی تھی اور اس عمل میں انتہائی احتیاط کے ساتھ سانس کا استعمال ہوتا تھا سبب یہ کہ اگر مطلوبہ مقدار سے کم یا زیادہ ہوا پھونکنی کے ذریعے پگھلے ہوئے شیشے تک پہنچتی تو شیشہ یا تو ٹوٹ جاتا یا بدہیئت ہو جاتا تھا۔ اس اصول کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے کہ ایک مقررہ حد سے نہ تو نیچے رہنا ہے اور نہ آگے بڑھنا ہے گویا حد اعتدال پر رہنا ہے۔ حد اعتدال اور توازن کا اختیار کرنا ہی عدل وانصاف کہلاتا ہے۔ زندگی کا کوئی شعبہ ہو اعتدال وتوازن اختیار کرنے میں ہی اس کی بقا ہے۔ کیوں کہ دنیا کے اس کارخانے کی مثال شیشہ گری کے کام کی طرح ہے۔ انسان کو اپنا ہر قدم احتیاط سے رکھنا چاہیے۔ میرؔ کا کہنا ہے:

؎ ہر دم قدم کو اپنے رکھ احتیاط سے یاں
یہ کارگہ ساری دکانِ شیشہ گر ہے

انسان کو دنیا میں حقوق العباد اور معاملات میں بھی انتہائی احتیاط سے کام لینا چاہیے۔ اُس کی ذات سے خلقِ خدا کو کوئی تکلیف نہیں پہنچنی چاہیے۔ کیوں کہ انسان معمولی سی غلطی پر اپنی قدر ومنزلت کھو بیٹھتا ہے اور بسا اوقات معمولی سی بے احتیاطی سے انسان کے دیرینہ تعلقات بھی ٹوٹ جاتے ہیں۔ عدمؔ کا کہنا ہے:

؎ سانس لینے سے ٹوٹ جاتے ہیں
دل کے رشتے عجیب ہوتے ہیں

اگر ہم روزمرہ زندگی پر نظر دوڑائیں تو احساس ہوتا ہے کہ ہم افراط وتفریط سے کام لیتے ہیں یا تو کسی چیز کو بالکل اہمیت نہیں دیتے یا اسے اتنی اہمیت دیتے ہیں کہ باقی چیزوں کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔ زندگی کے بارے میں یہ رویہ درست نہیں ہے۔ کیوں کہ اس طرح کا نقطۂ نظر رکھنے والے لوگ جو فیصلہ کرتے ہیں وہ جذباتی نوعیت کا ہوتا ہے اور زندگی جذبات سے نہیں بلکہ عقل وشعور سے ترقی کرتی ہے۔

www.pakcity.org www.pakcity.org

www.pakcity.org www.pakcity.org www.pakcity.org

''شعر میں کائنات کے کام کو شیشہ گری کے کام سے تشبیہ دی گئی ہے۔''

شعر نمبر 5:

ٹک میرؔ جگر سوختہ کی، جلد خبر لے
کیا یار بھروسہ ہے، چراغِ سحری کا

مفہوم:

میرؔ کی مثال صبح کے چراغ کی طرح ہے جو نا معلوم کب ختم ہو جائے اس لیے جتنی جلد ہو سکے اس کی خیر و عافیت معلوم کر لو۔

☆☆☆☆☆

www.pakcity.org
EDUCATION
pakcity.org

www.pakcity.org www.pakcity.org

www.pakcity.org www.pakcity.org www.pakcity.org

میر تقی میر (غزل نمبر 2)

شعر نمبر 1: (بورڈ 2011)

گل کو ہوتا صبا قرار اے کاش!
رہتی ایک آدھ دن، بہار اے کاش!

تشریح: خدائے سخن میر تقی میرؔ اردو کے شہرۂ آفاق غزل گو شاعر تھے۔ غمِ دوراں اور غمِ جاناں پر مبنی میرؔ کے اشعار زندگی کی تلخیوں کے ترجمان بھی ہیں اور حقیقتوں کے عکاس بھی۔

زیرِ تشریح شعر میں میرؔ کہتے ہیں کہ ''اے صبح کی ہوا! کاش پھول ہمیشہ رہتا اور بہار کچھ دن مزید رہ جاتی۔''

باغ کی ساری رونقیں پھول کی بدولت ہوتی ہیں۔ پھول اپنی نزاکت، رنگت، خوشبو اور خوبصورتی سے باغ کے حُسن کو چار چاند لگا دیتا ہے۔ موسمِ بہار میں جب مختلف رنگوں کے پھول کھلتے ہیں تو عاشق پرندے مسرت اور خوشی سے چہچہاتے ہیں۔ مگر کائنات کی دوسری چیزوں کی طرح پھول کی زندگی بھی عارضی ہے اور دیکھتے ہی دیکھتے پھول بھی مرجھا جاتا ہے۔ میرؔ کا کہنا ہے:

؎ کہا میں نے کتنا ہے گل کا ثبات
کلی نے یہ سن کر تبسم کیا

شعر میں صبا (صبح کی ہوا) کو مخاطب کر کے اُسے پھول کی عارضی زندگی کے دکھ میں شریک کیا گیا ہے اور اس حسرت کا اظہار کیا گیا ہے کہ کاش پھول کی زندگی طویل ہوتی۔ دراصل صبح کی ہوا کا پھول کی زندگی میں بڑا عمل دخل ہوتا ہے۔ پھول کا کھلنا، ہر طرف اُس کی خوشبو پھیلنا اور اُس پھول کا مرجھانا ہوا کی بدولت ہی ہوتا ہے۔ اسی لیے شاعر پھول کی عارضی زندگی کا غم صبح کی ہوا سے بیان کر رہا ہے۔

دیکھا جائے تو جس طرح پھول کی زندگی عارضی اور مختصر ہوتی ہے اسی طرح وصل کے خوب صورت ایام، محبوب کے ساتھ گزرے حسین لمحات بھی عارضی اور مختصر ہوتے ہیں۔ چناں چہ میرؔ کی یہ آرزو اور حسرت ہے کہ کاش وصل کے ان مختصر لمحات میں اضافہ ہو جاتا۔ احمد فرازؔ کا کہنا ہے:

؎ تیری قربت کے لمحے پھول جیسے
مگر پھولوں کی عمریں مختصر ہیں

تشریح طلب شعر کے دوسرے مصرعے میں ایک اور حسرت کا اظہار کیا گیا ہے کہ کاش بہار بھی کچھ دن مزید رہ جاتی۔ بہار کے موسم کا ذکر اردو شاعری میں دو حوالوں سے ہوتا ہے۔ 1: خوش گوار موسم کے حوالے سے۔ 2: وصل یا اچھے حالات کے حوالے سے۔

انسانی فطرت ہے کہ انسان خوش گوار ماحول میں زندگی بسر کرنا چاہتا ہے کیوں کہ ماحول کے اثرات انسانی زندگی پر بڑی شدت کے ساتھ ہوتے ہیں۔ اگر ماحول خوش گوار ہو تو انسان کی طبیعت بھی بشاش رہتی ہے۔ بہار کا موسم خوش گوار موسم ہوتا ہے۔ بہار کے آتے ہی ہر چیز خوب صورت ہو جاتی ہے۔ ٹھنڈی ہوائیں چلتی ہیں۔ ہر طرف سبزہ اور ہریالی نظر آتی ہے۔ لیکن افسوس کہ بہار کا خوش گوار موسم بھی عارضی اور مختصر ہوتا ہے اور دیکھتے ہی دیکھتے بہار کے خوب صورت ایام بھی گزر جاتے ہیں۔ عدمؔ کا کہنا ہے:

؎ مسکرانے لگی تھی ایک کلی
کہ اچانک بہار بیت گئی

بہار کے جاتے ہی باغ کا نقشہ بدل جاتا ہے۔ باغ پر اُداسی چھا جاتی ہے۔ پھول مرجھا جاتے ہیں، پتے جھڑ جاتے ہیں، پرندے باغ

www.pakcity.org www.pakcity.org

www.pakcity.org www.pakcity.org www.pakcity.org

سے ہجرت کر جاتے ہیں اور باغ ویران دکھائی دیتا ہے۔ بہار کے جانے کا دکھ نہ صرف انسانوں، درختوں، پرندوں کو ہوتا ہے بلکہ دنیا کی ہر چیز بہار کے جانے کا افسوس کرتی ہے۔ آتش کا کہنا ہے:

بلبل ہی کو بہار کے جانے کا غم نہیں
ہر برگ ہاتھ ملتا ہے گلزار کے لیے

اُردو شاعری میں بہار کا ذکر اچھے حالات اور وصل کی علامت کے طور پر کیا جاتا ہے اور اس کے برعکس خزاں کو برے حالات کی علامت بنایا جاتا ہے۔ انسان کی زندگی کے اچھے حالات اور اچھے دن بھی بہار کی طرح خوش گوار اور محدود ہوتے ہیں اور دیکھتے ہی دیکھتے انسان کی زندگی کے اچھے دن بھی گزر جاتے ہیں۔ ہر انسان کی خواہش ہوتی ہے کہ اچھے حالات اور وصل کے ایام مزید بڑھ جائیں مگر حقیقت یہ ہے کہ زندگی کے خوش گوار لمحات بہت تیزی سے گزر جاتے ہیں اور بُرے حالات جانے کا نام ہی نہیں لیتے۔ اقبالؒ کا کہنا ہے:

مہینے وصل کے گھڑیوں کی صورت اُڑتے جاتے ہیں
اور گھڑیاں جدائی کی گزرتی ہیں مہینوں میں

شعر نمبر 2:

یہ جو دو آنکھیں، مند گئیں میری
اس پہ وا ہوتیں، ایک بار اے کاش!

تشریح: خدائے سخن میر تقی میرؔ اردو کے شہرۂ آفاق غزل گو شاعر تھے۔ غمِ دوراں اور غمِ جاناں پر مبنی میرؔ کے اشعار زندگی کی تلخیوں کے ترجمان بھی ہیں اور حقیقتوں کے عکاس بھی۔

زیرِ تشریح شعر میں میرؔ کہتے ہیں کہ ''میری دو آنکھیں جو بند ہو گئی ہیں کاش موت سے پہلے ایک دفعہ محبوب کو دیکھ لیتیں۔''

انسانی فطرت ہے کہ انسان کو جو شے اچھی لگتی ہے۔ انسان اسے ہمیشہ اپنی نظروں کے سامنے موجود دیکھنا چاہتا ہے۔ جوں جوں وابستگی بڑھتی ہے اسی اعتبار سے دیکھنے کی خواہش بھی بڑھ جاتی ہے۔ وہ ہستی چاہے اللہ کی ذات ہو، اپنے جیسا کوئی انسان ہو یا کوئی اور شے ہو انسان کو جتنی اچھی لگتی ہے، اتنا ہی انسان اسے دیکھتے رہنا چاہتا ہے۔ حضرتِ موسیٰ علیہ السلام نے بھی اللہ تعالیٰ سے دیدار کی خواہش کا اظہار کیا۔ اقبالؒ کی شاعری میں بھی اللہ تعالیٰ کے دیدار کی خواہش کا مضمون کثرت سے ملتا ہے۔ اسی طرح اگر محبوب مجازی بھی ہو تو عاشق کی کی آنکھ کو محبوب کے دیدار کا انتظار رہتا ہے۔ لیکن ایک طویل انتظار کے بعد بھی جب اُس کو دیدار نصیب نہیں ہوتا تو اُس کی آنکھیں محبوب کے انتظار میں بے نور ہو جاتی ہیں اور ایک دن آتا ہے کہ جب اُس کی آنکھیں بالکل ہی بند ہو جاتی ہیں۔ میرؔ کا کہنا ہے:

آنکھیں گئیں روتے روتے لیکن
تُو نے نہ اِدھر کو یار دیکھا

عاشق کی آنکھ بند ہو جاتی ہے لیکن پھر بھی اُس کی حسرتِ دیدار برقرار رہتی ہے۔ زندگی میں محبوب عاشق کو دیدار سے محروم رکھتا ہے۔ عاشق کی حسرت ہوتی ہے کہ کاش ایک بار مرتے مرتے ہی محبوب سے اُس کا سامنا ہو جائے تاکہ اُسے زندگی کے آخری لمحات میں دیکھ لے۔ عاشق کی جان محبوب کے انتظار میں آنکھوں میں آئی ہوتی ہے اور اُس کی یہی آخری حسرت ہوتی ہے کہ کاش محبوب اُس کی آنکھوں میں بھری سچائی اور انتظار دیکھ سکے۔ میرؔ کا کہنا ہے:

آنکھوں میں جی میرا ہے اِدھر یار دیکھنا
عاشق کا اپنے آخری دیدار دیکھنا

www.pakcity.org www.pakcity.org

www.pakcity.org www.pakcity.org www.pakcity.org

''جب وقت محدود ہو اور جدائی یقینی ہو تو ایسے میں محبت بڑھ جاتی ہے اور ایک ایک پل انسان کو قیمتی محسوس ہوتا ہے۔'' اسی لیے وہ شخص جو موت کے قریب ہو اس کی خواہش ہوتی ہے کہ وہ ہستی جسے وہ ٹوٹ کر چاہتا ہے اس کی آنکھوں کے سامنے موجود رہے۔ میر تقی میرؔ کا موقف بھی یہی ہے کہ وہ آنکھیں جو ہمیشہ کے لیے بند ہو رہی ہیں کاش آخری دفعہ محبوب کو دیکھ سکتیں اور مرتے وقت محبوب سے آمنا سامنا ہو جاتا۔ داغؔ کا کہنا ہے:

؎ آرزو یہ ہے کہ نکلے دم تمہارے سامنے
تم ہمارے سامنے ہو ہم تمہارے سامنے

تشریح طلب شعر کا ایک پہلو یہ بھی ہو سکتا ہے کہ عاشق کی موت کے بعد عام طور پر محبوب کو ندامت اور شرمندگی ہوتی ہے اور محبوب عاشق کی لاش پر آتا ہے تو اُس وقت عاشق کی یہی کیفیت اور حسرت ہوتی ہے کہ کاش اُس کی بند آنکھیں کھُلیں اور مرتے مرتے محبوب کا دیدار نصیب ہو جائے۔ جوش ملیح آبادی نے یہی مضمون بڑے آسان لفظوں میں بیان کیا ہے۔

؎ اُن کی صورت ذرا دکھا دینا
منھ سے میرے کفن ہٹا دینا

مومن خاں مومنؔ کا کہنا ہے:

؎ وہ آئے ہیں پشیماں لاش پر اب
تجھے اے زندگی لاؤں کہاں سے

شعر نمبر 3:

کن نے اپنی مصیبتیں نہ گنیں
رکھتے میرے بھی غم، شمار اے کاش!

تشریح: خدائے سخن میر تقی میرؔ اردو کے شہرۂ آفاق غزل گو شاعر تھے۔ غمِ دوراں اور غمِ جاناں پر مبنی میرؔ کے اشعار زندگی کی تلخیوں کے ترجمان بھی ہیں اور حقیقتوں کے عکاس بھی۔

زیرِ تشریح شعر میں میرؔ کہتے ہیں کہ ''دنیا میں ہر کوئی اپنے غم گنتا رہتا ہے کاش کوئی میرے غم بھی شمار کر لیتا۔''

غم ہمیشہ احساسِ محرومی سے جنم لیتا ہے۔ جب انسان کی کوئی خواہش پوری نہ ہو، اُس سے کوئی چیز چھن جائے، اُسے کسی شے سے محروم کر دیا جائے تو اُسے دُکھ ہوتا ہے۔ انسان کو دنیا کی زندگی میں کئی غموں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ غم کبھی تو جان و مال کی کمی اور نقصان کی صورت میں ہوتا ہے اور کبھی خاندانی مسائل اور بیماریاں بھی انسان پر غم اور مصیبت بن کر ٹوٹتی ہیں۔ اسی طرح عشق میں بھی عاشق کو بہت سے غم برداشت کرنے پڑتے ہیں۔ غرضیکہ انسانی زندگی غموں، دُکھوں، پریشانیوں، مصیبتوں اور تکلیفوں کا مجموعہ ہے۔ میرؔ نے اپنے ایک اور خوب صورت شعر میں زندگی کے مسلسل غموں کی داستان کچھ یوں سنائی ہے:

؎ غم رہا جب تلک کہ دم میں دم رہا
دم کے جانے کا نہایت غم رہا

میر تقی میرؔ کا موقف ہے کہ دکھ تو ہر کسی کو ملتا ہے لیکن بیشتر لوگوں کے غم اور دکھ محدود ہوتے ہیں، گنے جا سکتے ہیں۔ لیکن جو دکھ مجھے ملے وہ ان گنت ہیں۔ ان کو کوئی شمار نہیں ہے۔ میرؔ کا کہنا ہے:

www.pakcity.org www.pakcity.org

www.pakcity.org www.pakcity.org www.pakcity.org

میرے ایک دل میں جو غم یہ ہے، سو فزوں ہے میرے شمار سے
نہ تو دس میں نہ پچاس میں نہ تو سو میں نہ ہزار میں

حسرت موہانی کا کہنا ہے:

دلوں کے زخم کا جب حساب نہ ہو
کیا کہیں گر نہ بے شمار کہیں

میر تقی میر کی ذاتی زندگی دیکھیں تو پتہ چلتا ہے کہ انھیں پے در پے بہت سی مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ بچپن میں ان کے والد انتقال کر گئے۔ بڑے بھائی نے گھر سے نکال دیا۔ آگرے سے دہلی آئے اپنے رشتے کے ماموں کے یہاں ٹھہرے لیکن ان سے بھی میر کی نہ بن سکی وہ گھر بھی چھوڑنا پڑا۔ میر ذہنی توازن کھو بیٹھے۔ علاج کے بعد تندرست تو ہو گئے مگر مصیبتوں نے پیچھا نہ چھوڑا۔ عشق میں ناکامی ہوئی۔ میر کے عہد کے اجتماعی حالات بھی ایسے ہی تھے کہ مسلسل مصیبتیں اجتماعی زندگی کو تباہ و برباد کر رہی تھیں۔ غرض میر کی ساری زندگی دُکھ جھیلتے ہوئے گزر گئی۔ تشریح طلب شعر میں وہ اپنے کسی غم خوار اور غم گسار دوست کی تلاش میں ہیں اور اُنھیں احباب سے یہ شکوہ ہے کہ ہر شخص اپنے ہی مسائل اور الجھنوں میں گرفتار ہے۔ کوئی بھی ایسا دوست یا درد آشنا نہیں ہے جو میری داستانِ غم سنے۔ مومن خان مومن کا کہنا ہے:

ہائے میں ڈھونڈ کے لاؤں کس کو
ماجرا اپنا سناؤں کس کو

ناصر کاظمی کا کہنا ہے:

ہر کوئی اپنے غم میں ہے مصروف
کس کو درد آشنا کہے کوئی

شعر نمبر 4: (بورڈ 2017ء)

جان آخر تو جانے والی تھی
اس پہ کی ہوتی، میں نثار اے کاش!

تشریح: خدائے سخن میر تقی میر اردو کے شہرۂ آفاق غزل گو شاعر تھے۔ غمِ دوراں اور غمِ جاناں پر مبنی میر کے اشعار زندگی کی تلخیوں کے ترجمان بھی ہیں اور حقیقتوں کے عکاس بھی۔

زیرِ تشریح شعر میں میر کہتے ہیں کہ ''جب زندگی عارضی اور ناپائیدار ہے تو کاش میں یہ زندگی محبوب پر قربان کر دیتا۔''

موت ایک اٹل حقیقت ہے۔ کائنات میں خدا، رسول ﷺ اور آخرت کا انکار کیا جاتا ہے لیکن کائنات کا کوئی شخص بھی اس حقیقت کا انکاری نہیں ہے۔ انسان کا مشاہدہ ہے کہ موت سے فرار ممکن نہیں۔ جو لوگ ماضی میں موجود تھے آج نظروں سے اوجھل ہو گئے ہیں۔ جو بھی یہاں آیا ہے اُسے ایک نہ ایک دن یہاں سے جانا ہے۔ ہر جان دار کا آخری انجام یہی ہوتا ہے کہ بالآخر وہ اس عارضی اور ناپائیدار زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھتا ہے۔ مومن خان مومن کا کہنا ہے:

آخر اک روز جان جانی ہے
یہی دو دن کی زندگانی ہے

میر تقی میر کی یہ حسرت ہے کہ جب جان نے بالآخر جانا ہی تھا تو کاش میں اپنی یہ جان محبوب پر ہی قربان کر دیتا۔ محبوب سے مراد اگر اللہ

www.pakcity.org www.pakcity.org

www.pakcity.org www.pakcity.org www.pakcity.org

کی ذات لیں تو اللہ کے لیے جان قربان کرنا ہر مسلمان کی دلی حسرت ہوتی ہے۔ حضور ﷺ کا ارشاد ہے کہ ''میرا جی چاہتا ہے کہ میں اللہ کے راستے میں شہید کیا جاؤں اور پھر زندہ کیا جاؤں، پھر شہید کیا جاؤں، پھر زندہ کیا جاؤں، پھر شہید کیا جاؤں، پھر زندہ کیا جاؤں۔'' انسان کے پاس زندگی اللہ کا دیا ہوا عطیہ ہے اور اللہ کی ذات ہی اِس لائق ہے کہ یہ زندگی اُسی کی راہ میں قربان کر دی جائے۔ غالبؔ کا کہنا ہے:

؎ جان دی، دی ہوئی، اُسی کی تھی
حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

اگر ''اُس'' سے مراد محبوب مجازی لیا جائے تو ہر سچے عاشق کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ وہ اپنی جان کا قیمتی تحفہ محبوب کی نذر کر دے۔ سچا عاشق ہر وقت محبوب کے لیے جان قربان کرنے کو تیار رہتا ہے۔ غالبؔ کا کہنا ہے:

؎ جان تم پہ نثار کرتا ہوں
میں نہیں جانتا دُعا کیا ہے

عشق کے میدان میں جان نثار کرنے کا ایک فائدہ یہ ہوتا ہے کہ عشق کی راہ میں جان قربان کرنے والے کا نام باقی رہ جاتا ہے۔ یوں اُس کی عارضی زندگی دائمی بن جاتی ہے اور دنیا سے جانے کے بعد بھی لوگوں میں اُس کی سچائی، وفاداری، خلوص اور جان بازی کے چرچے رہتے ہیں۔ حسرتؔ کا کہنا ہے:

؎ تم پر مٹے تو زندہ جاوید ہو گئے
ہم کو بقا نصیب ہوئی ہے فنا کے بعد

محبوب پہ جان قربان کرنے کی ایک وجہ یہ بھی ہوتی ہے کہ عاشق اپنی جان قربان کر کے محبوب کو اپنی سچائی کا ثبوت دیتا ہے۔ وہ زندگی بھر محبوب کے سامنے جان تک قربان کر دینے کے دعوے کرتا رہتا ہے۔ اُس کی یہ خواہش اور حسرت ہوتی ہے کہ محبوب پر جان قربان کر کے اپنے دعووں پر عمل کر دکھائے اور محبوب کو بھی اس کی سچائی کا یقین ہو جائے۔ حسرت موہانی کا کہنا ہے:

؎ مر مٹے ہیں اِس لیے کہ ہمیں
شاید وہ اپنا جاں نثار کہیں

شعر نمبر 5:

(بورڈ 2017ء)

اس میں راہِ سخن نکلتی تھی
شعر ہوتا ترا شعار، اے کاش!

تشریح: خدائے سخن میر تقی میرؔ اردو کے شہرۂ آفاق غزل گو شاعر تھے۔ غمِ دوراں اور غمِ جاناں پر مبنی میرؔ کے اشعار زندگی کی تلخیوں کے ترجمان بھی ہیں اور حقیقتوں کے عکاس بھی۔

زیرِ تشریح شعر میں میرؔ کہتے ہیں کہ ''اے محبوب! اگر تمھیں شاعری سے دل چسپی ہوتی تو ہمارے تمھارے درمیان گفتگو کا امکان بھی موجود ہوتا۔''

ہر عاشق کی یہ حسرت ہوتی ہے کہ کسی طرح محبوب سے گفتگو اور بات چیت کی کوئی راہ نکلے۔ وہ دن رات یہی سوچتا رہتا ہے کہ کس طرح محبوب سے گفتگو کا سلسلہ بنے۔ تشریح طلب شعر میں بھی میر کا موقف بھی یہی ہے کہ محبوب سے ہماری بات چیت کا راستہ اس طرح نکل سکتا تھا کہ

www.pakcity.org www.pakcity.org

www.pakcity.org www.pakcity.org www.pakcity.org

اُسے بھی شاعری کی سوجھ بوجھ ہوتی۔ دراصل شعروشاعری سے انسان اپنے دل کی کیفیات اور جذبات کا اظہار کرتا ہے۔ وہ اپنے ساتھ پیش آنے والے حالات کو شعروں کے سانچے میں ڈھالتا ہے۔ حبیب جالبؔ کا کہنا ہے:

اپنی تو داستاں ہے بس اتنی
غم اُٹھائے ہیں، شاعری کی ہے

شاعری دراصل انسانی جذبات کی عکاسی ہے اور شاعر 'شاعری کے پردے' میں محبوب سے گفتگو کرتا ہے۔ جو بات شاعر محبوب کے روبرو بیان نہیں کرسکتا اُس کا اظہار اپنے اشعار کے ذریعے کرتا ہے۔ اسی طرح معاشرتی پابندیوں کی وجہ سے عاشق سرِ عام محبوب سے گفتگو نہیں کرسکتا۔ اسی لیے وہ شاعری کو محبوب سے گفتگو کا ایک پردہ بناتا ہے اور اسی پردے میں اپنے دل کا غم بیان کرتا ہے۔ میرؔ کا کہنا ہے:

اس پردے میں غمِ دل کہتا ہے میر اپنا
کیا شعر و شاعری ہے یارو! شعارِ عشق

شعروشاعری میں عام طور پر کئی فنی خوبیاں پائی جاتی ہیں۔ شاعر اپنا خیال پیش کرتے ہوئے تشبیہات، استعارات، تلمیحات اور مختلف کنایات کا استعمال کرتا ہے۔ شاعری کی یہ باریکیاں ہر شخص کی سمجھ سے بالاتر ہوتی ہیں۔ یہ خوبیاں صرف وہی سمجھ سکتا ہے جو فنِ شاعری سے آشنا ہو۔ میرؔ کا بھی یہی کہنا ہے کہ میرا محبوب شعروشاعری میں خاص دلچسپی نہیں رکھتا۔ اُسے شاعری کی سوجھ بوجھ نہیں ہے۔ اسی لیے کسی شاعر کے اشعار اُسے متاثر نہیں کرتے۔ آتشؔ کا کہنا ہے:

دہنِ یار میں نہ آئی بات
شاعروں نے بہت بنائی بات

میر تقی میرؔ کا موقف یہ ہے کہ ہماری زندگی کا مرکز ومحور شاعری ہے لیکن محبوب کو شاعری سے کچھ دل چسپی نہیں ہے اس لیے ہمارے اور اس کے درمیان گفتگو کا کوئی امکان بھی موجود نہیں ہے۔ اگر اسے شاعری سے دل چسپی ہوتی ہمارے درمیان گفتگو ہوتی تو شاید دوستی کے امکانات بھی پیدا ہوجاتے لیکن افسوس ایسا نہیں ہوا بلکہ ہمیں شاعر بنانے والا خود شاعری سے ناآشنا رہا۔ احمد فرازؔ کا کہنا ہے:

ستم تو یہ کہ ظالم سخن شناس نہیں
وہ اک شخص کہ شاعر بنا گیا مجھ کو

عام طور پر دو افراد کے درمیان کوئی تعلق اسی وقت تشکیل پاتا ہے جب ان کے درمیان کوئی قدر مشترک ہو۔ دوستی بھی تبھی ہوتی ہے جب افراد کی دلچسپیاں مشترک ہوں۔ شاعر کی بھی یہی خواہش ہے کہ کاش اگر محبوب شاعری سے آشنا ہوتا تو ہم میں شاعری کی قدر مشترک ہوجاتی اور یوں ہماری گفتگو کا سلسلہ بن جاتا۔ غالبؔ کا کہنا ہے:

سیکھے ہیں مہ رخوں کے لیے ہم مصوری
تقریب کچھ تو بہر ملاقات چاہیے

شعر نمبر 6:

شش جہت اب تو تنگ ہے ہم پر
اس سے ہوتے نہ ہم دو چار، اے کاش!

تشریح: خدائے سخن میر تقی میرؔ اردو کے شہرۂ آفاق غزل گو شاعر تھے۔ غمِ دوراں اور غمِ جاناں پر مبنی میرؔ کے اشعار زندگی کی تلخیوں کے ترجمان بھی

www.pakcity.org www.pakcity.org

www.pakcity.org www.pakcity.org www.pakcity.org

ہیں اور حقیقتوں کے عکاس بھی۔

زیرِ تشریح شعر میں میرؔ کہتے ہیں کہ ''دنیا اپنی وسعت کے باوجود مجھ پر تنگ ہوگئی ہے۔ کاش میرا محبوب سے سامنا نہ ہوتا۔''

محبت کے بارے میں دو مختلف رویے موجود ہیں بعض لوگوں کا موقف یہ ہے کہ محبت کا غم دنیا بھر کے دکھوں کا مداوا بن جاتا ہے لیکن بیشتر لوگ یہی سمجھتے ہیں کہ محبت کرنا دنیا بھر کی مصیبتوں کو گلے لگا لینا ہے اور محبت کرنے والے کو دکھوں کے علاوہ کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ عشق آگ کا ایک دریا ہے جس میں عاشق کو قدم قدم پر مصیبتوں، پریشانیوں اور غموں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ جگرؔ مرادآبادی کا کہنا ہے:

؎ یہ عشق نہیں آساں بس اتنا سمجھ لیجیے
اک آگ کا دریا ہے اور ڈوب کے جانا ہے

تشریح طلب شاعر میں میرؔ کا موقف بھی یہی ہے کہ محبوب سے ملاقات سے قبل میں خوش حال تھا، مسرور اور دلشاد تھا، بے فکر اور آباد تھا لیکن محبوب کا سامنا ہوتے ہی ساری خوشیاں تباہ ہوگئیں اور اتنی تکلیفوں کا سامنا کرنا پڑا کہ چھ اطراف (دائیں، بائیں، آگے، پیچھے، اوپر، نیچے) مجھ پر تنگ ہوگئی ہیں۔ یعنی میں ہر طرف سے پھنس گیا ہوں اور یہ ساری مصیبتیں صرف محبوب کی وجہ سے ہی پیش آئی ہیں۔ جوشؔ ملیح آبادی کا کہنا ہے:

؎ جب سے عاشق ہوئے ہیں تمھارے ہم
لگ گئے گور کے کنارے ہم

میرؔ کا موقف یہ ہے کہ محبت کرنے کے بعد مجھے اتنے دُکھ اور مصیبتیں جھیلنی پڑی ہیں کہ جینا دشوار ہوگیا ہے۔ یہ دنیا اپنی وسعت کے باوجود تنگ محسوس ہونے لگی ہے۔ محبوب کی بے رُخی اور محبت کے دشمن معاشرے نے ایسی مصیبتیں کھڑی کر دی ہیں جن سے بچنا ممکن نہیں ہے۔ کاش میں محبوب سے یاری نہ کرتا اور اُس سے میرا سامنا نہ ہوتا تو مجھے یہ مسائل نہ دیکھنے پڑتے۔ میرؔ کا کہنا ہے:

؎ خاک ہی میں ملائے رکھتے ہو
ہو کوئی تم سے آشنا کیا خاک

یا میرؔ کا کہنا ہے:

؎ پھرتے ہیں میرؔ خوار، کوئی پوچھتا نہیں
اِس عاشقی میں عزتِ سادات بھی گئی

دوسرے مصرعے میں لفظ ''اُس'' کو اگر اِس پڑھا جائے تو ایک مفہوم یہ سامنے آتا ہے کہ کاش میں پریشانی کی اس صورتحال سے دوچار نہ ہوتا۔ میرؔ کو اپنی زندگی میں بہت سی پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑا ہے۔ بچپن میں باپ کا سایہ سر سے اُٹھ گیا۔ خاندان اور گھر سے دوری برداشت کرنا پڑی۔ عشق ناکام ہوا اور معاشی حالات بھی خراب رہے۔ الغرض اُن کی زندگی دکھوں اور غموں کا مجموعہ رہی۔ اُن کا کہنا ہے:

؎ ہر صبح مرے سر پہ قیامت گزری
ہر شام نئی اک مصیبت گزری

☆☆☆☆☆

www.pakcity.org www.pakcity.org

www.pakcity.org www.pakcity.org www.pakcity.org

حیدر علی آتش (غزل نمبر 1)

مشکل الفاظ و تراکیب کی تفہیم

الفاظ	مفہوم
عدم	نہ ہونا، مراد ہے ''دوسری دنیا جہاں مرنے کے بعد جانا ہے''
شرحِ آرزو	خواہش کی وضاحت
کوچ	سفر، روانگی
ہستی	ہونا، مراد ہے ''زندگی''
بدرقہ	رہبر، رہنما
عنایتِ پروردگار	اللہ تعالیٰ کی مہربانی
خُوب ہوا	اچھا ہی ہوا
عالَم	کیفیت
دیار	شہر
برگشتہ طالعی	بدنصیبی

شعر نمبر 1: (بورڈ 2018ء)

ہوائے دور مئے خوش گوار راہ میں ہے
خزاں چمن سے ہے جاتی بہار راہ میں ہے

تشریح: خواجہ حیدر علی آتش کا شمار اردو ادب کے مشہور غزل گو شعرا میں ہوتا ہے۔ غمِ عشق، غمِ زمانہ اور آفاقی موضوعات پر مشتمل آتش کے اشعار زندگی کی حقیقتوں کے ترجمان بھی ہیں اور معاملاتِ محبت کے عکاس بھی۔

زیرِ تشریح شعر میں آتش کہتے ہیں کہ ''خوشگوار شراب کے دور کی ہوا'' راستے میں ہے، باغ سے خزاں جا رہی ہے اور بہار آنے والی ہے۔''

شاعر نے دو چیزوں کے آنے کی خبر دی ہے۔ (۱) خوش گوار شراب کے دور کی ہوا (۲) خزاں کے بعد بہار۔

ایرانیوں کا یہ طریقہ تھا کہ وہ موسمِ بہار کی آمد پر جشنِ نوروز منایا کرتے تھے۔ باغوں میں اکھٹے ہو کر مے کشی کیا کرتے تھے اور بہار کے موسم سے لطف اندوز ہوتے تھے۔ آتش کا موقف یہ ہے کہ شراب کے نشے سے بھرپور مست اور جھومتی ہوائیں چل پڑی ہیں۔ ان ہواؤں میں شراب کی تاثیر محسوس ہوتی ہے۔ چوں کہ کسی بھی تبدیلی سے پہلے تبدیلی کے امکانات دکھائی دینے لگتے ہیں۔ اس لیے ان ہواؤں کے چلنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ عنقریب ایک ایسا ماحول پیدا ہونے والا ہے جو ہر ایک کے لیے فرحت، خوشی، لطف اور سکون کا ذریعہ بنے گا۔ آتش کا کہنا ہے:

www.pakcity.org www.pakcity.org

www.pakcity.org www.pakcity.org www.pakcity.org

لطفِ چمن ہے بلبلِ گلزار کے لیے
کیفیتِ شراب ہے مے خوار کے لیے

جس طرح شراب کا دور چل رہا ہو تو وہاں بیٹھے ہوئے لوگوں کے پاس شراب کا پیالہ پہنچ جاتا ہے اور اس میں تکرار بھی موجود ہوتی ہے اسی طرح موسموں کی تبدیلی میں بھی دہرائے جانے کا عمل یا تکرار کو دیکھا جا سکتا ہے۔ بہار کے بعد خزاں اور خزاں کے بعد بہار کا آنا اسی تکرار کو ظاہر کرتا ہے۔ موسمِ خزاں میں باغ میں ہر طرف اُداسی اور ویرانی چھائی ہوتی ہے۔ لیکن خزاں کے موسم میں شاعر کو بہار کے آنے کے اثرات دکھائی دے رہے ہیں اور وہ پُراُمید ہے کہ بہت جلد خزاں جانے والی ہے اور بہار کا دل کش موسم آنے والا ہے جب ہر طرف سبزہ ہی سبزہ ہوگا، پھول کھلیں گے، پرندے چہچہائیں گے۔ غرض باغ کی ہر چیز خوش و خرم نظر آئے گی۔ میرؔ کا کہنا ہے:

چلتے ہو تو چمن کو چلیے، سُنتے ہیں کہ بہاراں ہے
پھول کھلے ہیں، پات ہرے ہیں، کم کم باد و باراں ہے

یا بقول عدمؔ:

فضا ہنس رہی ہے، ہوا گا رہی ہے
بڑی تمکنت سے بہار آ رہی ہے

اگر ہوائے دورے خوش گوار، خزاں اور بہار کو سماجی اعتبار سے علامت کی نظر سے دیکھیں تو یہ مفہوم بنے گا کہ بہت جلد حالات بہتر ہو جائیں گے اور جو مشکلات یا مصیبتیں معاشرہ برداشت کر رہا ہے ان سے چھٹکارا حاصل ہو جائے گا۔ آتشؔ اُمید اور رجائیت کا شاعر ہے اور آتشؔ کو حالات کی بہتری کی اُمید نظر آ رہی ہے اور وہ اُمید کا درس دیتے ہوئے یہ کہہ رہے ہیں کہ اگرچہ غموں، دُکھوں اور تلخیوں نے زندگی تباہ کر دی ہے لیکن ہم پھر بھی پُراُمید ہیں کیوں کہ قدرت کا اصول ہے کہ ہر دُکھ کے بعد آسانی ہے۔ ارشادِ ربانی ہے۔

''بے شک تکلیف کے ساتھ آسانی ہے، بے شک تکلیف کے ساتھ آسانی ہے''

اسی طرح اگر خزاں اور بہار کو محبت کے حوالے سے دیکھیں تو یہ مفہوم سامنے آئے گا کہ محبوب کے ملنے کی توقع ہے۔ کیوں کہ محبت کرنے والے کے لیے محبوب سے بچھڑنا خزاں اور اس سے ملنا بہار کے آنے کے مترادف ہے۔

آتشؔ کا موقف یہ ہے کہ خوش گوار ہوا کے چلنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ بہار کی آمد آمد ہے اور خزاں یا پت جھڑ کے دن ختم ہونے والے ہیں۔ آتشؔ کا کہنا ہے:

بہارِ گلستاں کی ہے آمد آمد
خوشی پھرتے ہیں باغباں کیسے کیسے

شعر نمبر 2: (بورڈ 19, 2018ء)

عدم کے کوچ کی لازم ہے فکر، ہستی میں
نہ کوئی شہر، نہ کوئی دیار، راہ میں ہے

تشریح: خواجہ حیدر علی آتشؔ کا شمار اردو ادب کے مشہور غزل گو شعرا میں ہوتا ہے۔ غمِ عشق، غمِ زمانہ اور آفاقی موضوعات پر مشتمل آتشؔ کے اشعار زندگی کی حقیقتوں کے ترجمان بھی ہیں اور معاملاتِ محبت کے عکاس بھی۔

www.pakcity.org www.pakcity.org

www.pakcity.org www.pakcity.org www.pakcity.org

زیرِ تشریح شعر میں آتش کہتے ہیں کہ ''زندگی میں آخرت کے سفر کی فکر بھی ضروری ہے کیوں کہ (آخرت کی) راہ میں کوئی شہر یا آبادی نہیں۔''

انسان دنیا کی ظاہری اور ناپائیدار چیزوں کے لیے فکر مند رہتا ہے اور وہ رات دن دنیا کی وقتی خوشیاں حاصل کرنے کے لیے کوشاں رہتا ہے۔ حالاں کہ دنیا کے اس سفر میں انسان کا ٹھہراؤ بہت عارضی ہے۔ اُسے زندگی آخرت کی تیاری کے لیے عطا کی گئی ہے۔ انسان یہ سمجھتا ہے کہ اُسے دنیا میں ہمیشہ رہنا ہے حالاں کہ دنیا کے اس عارضی گھر میں آنے والے ہر شخص کا انجام یہی ہوتا ہے کہ بالآخر اُسے آخرت کا سفر کرنا ہوتا ہے۔ ابراہیم ذوقؔ کا کہنا ہے:

؎ یہ اقامت ہمیں پیغامِ سفر دیتی ہے
زندگی موت کے آنے کی خبر دیتی ہے

ہر انسان کو دنیا سے آخرت کا سفر کرنا ہے۔ لہٰذا اُسے آخرت کی تیاری بھی کر لینی چاہیے۔ ہزاروں آیات و احادیث میں آخرت کے تذکرے موجود ہیں اور انسان کو آخرت کی تیاری کا حکم دیا گیا ہے۔ ارشادِ نبوی ﷺ ہے۔ ''عقل مند وہ ہے جو موت کی تیاری کرے۔''

انسان کی دُنیاوی زندگی عارضی اور مختصر ہے۔ جب کہ آخرت کا گھر دائمی اور ہمیشہ کے لیے ہے۔ لہٰذا انسان کو فکرِ دنیا سے آزاد ہو کر اپنے حقیقی اور دائمی گھر یعنی آخرت کے سفر کی تیاری رکھنی چاہیے۔ آتشؔ کا کہنا ہے:

؎ ہستی فانی ہے آتشؔ، چار دن میں نیستی
فکرِ عقبیٰ کرے، دنیا کو انساں چھوڑ کر

یا بقول آتشؔ:

؎ ہستی میں یاد آئے نہ کیوں کر عدم مجھے
وہ آدمی نہیں جسے حُب الوطن نہ ہو

انسان کے لیے لازمی ہے کہ وہ اس دنیا سے توشۂ آخرت لے کر چلے۔ کوئی ایسا سفر جو انسان نے ہر حال میں کرنا ہو تو انسان سفر میں پیش آنے والی ضروریات اور منزل تک پہنچ کر ضرورت پڑنے والی چیزیں ساتھ لے کر چلتا ہے۔ اگر منزل مقصود کے راستے میں کوئی ایسا شہر یا بستی موجود ہو تو انسان کو حوصلہ رہتا ہے اور اس کے برعکس اگر دورانِ سفر کوئی ایسا شہر یا بستی موجود نہ ہو جہاں سے زادِ راہ لیا جا سکے تو انسان فطری طور پر زیادہ محتاط ہو جاتا ہے اور کسی طرح کا خطرہ مول لینے کی کوشش نہیں کرتا۔ آخرت کا سفر بھی ہر انسان نے تنہا اور اکیلے طے کرنا ہے۔ دنیا سے جاتے ہی انسان کے سارے رشتے، مال و دولت اور عہدے اُسے تنہا چھوڑ دیتے ہیں۔ لہٰذا انسان کو آخرت کے سفر کے لیے فکر مند اور تیار رہنا چاہیے۔ میرؔ کا کہنا ہے:

؎ فکر کر زادِ آخرت کا بھی
میرؔ اگر تو ہے عاقبت اندیش

آخرت کے سفر کے دوران میں کوئی ایسا ٹھکانا موجود نہیں جہاں رک کر انسان اپنی ضرورت کی چیزیں لے سکے کیوں کہ انسانی اعمال اس کی زندگی سے وابستہ ہوتے ہیں اس لیے حضور ﷺ نے فرمایا کہ ''دنیا آخرت کی کھیتی ہے۔'' جیتے جی انسان کو اس بات کا خیال رکھنا چاہیے وہ نیک اعمال جو آخرت کے سفر میں اس کے کام آنے ہیں، اس کے پاس ہونے چاہئیں اور اُسے آخرت کے اس ہولناک اور خوفناک سفر کے لیے بھی فکر مند ہونا چاہیے۔ اکبرؔ الہ آبادی کا کہنا ہے:

www.pakcity.org www.pakcity.org

www.pakcity.org www.pakcity.org www.pakcity.org

وقتِ طلوع دیکھا، وقتِ غروب دیکھا
اب فکرِ آخرت ہے، دنیا کو خوب دیکھا

خواجہ حیدر علی آتش ہمیں خبردار کرتے ہیں کہ اس دنیا کو بچوں کا کھیل نہیں سمجھنا چاہیے۔ انسان پر یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ جیتے جی مال واسباب جمع کرلے جو آخرت کے سفر میں کام آنا ہے۔ اس کے پاس نیک اعمال کی وہ دولت ہونا چاہیے جس کے بل بوتے پر وہ آخرت کا سفر آسانی سے طے کرلے اور قیامت والے دن بھی سرخرو رہے۔ آتش کا کہنا ہے:

بے خبر ایک دن سفر ہے شرط
کہے رکھتے ہیں ہم، خبر ہے شرط

شعر نمبر 3: (بورڈ 2007,19)

نہ بدرقہ ہے، نہ کوئی رفیق ساتھ اپنے
فقط عنایت پروردگار، راہ میں ہے

تشریح: خواجہ حیدر علی آتش کا شمار اردو ادب کے مشہور غزل گو شعرا میں ہوتا ہے۔ غمِ عشق، غمِ زمانہ اور آفاقی موضوعات پر مشتمل آتش کے اشعار زندگی کی حقیقتوں کے ترجمان بھی ہیں اور معاملاتِ محبت کے عکاس بھی۔

زیرِ تشریح شعر میں آتش کہتے ہیں کہ ''(آخرت کے) سفر میں کوئی رہنما یا دوست نہیں ہے بلکہ صرف اللہ ہی کی مہربانی شاملِ حال ہے۔''

کوئی بھی ایسا سفر جو انسان پہلی دفعہ کر رہا ہو، ان دیکھے راستوں پر چلتے ہوئے منزل تک پہنچنے کے لیے انسان کو راہ نما کی ضرورت ہوتی ہے جو اسے کامیابی کے ساتھ منزل تک پہنچا دے۔ اگر رہنما موجود نہ ہو تو انسان کے لیے سفر کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ اسی طرح اگر کسی سفر میں انسان کے ساتھ کوئی دوست یا ہم سفر ہو تو سفر سہولت اور آسانی کے ساتھ گزر جاتا ہے۔ آخرت کا سفر ایک ایسا سفر ہے جس میں انسان کا کوئی رہنما یا دوست نہیں ہوتا بلکہ یہ سفر انسان کو تنہا ہی طے کرنا ہوتا ہے۔

آتش کا موقف یہ ہے کہ ہم ایک ایسے راستے پر گامزن ہیں کہ نہ تو ہمیں کوئی راہ نما میسر ہے اور نہ ہی کوئی دوست ہے جو مشکل پڑنے پر کام آئے اگر کچھ ہے تو وہ صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کی مہربانی ہے۔ دراصل آخرت کا سفر ایسا سفر ہے جو انسان کو تنہا طے کرنا ہوتا ہے۔ حشر کے میدان میں انسان اپنے بھائی، ماں باپ، اپنے بیوی بچوں سے بھاگے گا، وہاں کوئی شخص کسی کی کچھ مدد نہیں کر سکے گا اسی طرح وہاں کسی کی کوئی سفارش بھی کام نہیں آئے گی بلکہ صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کی مہربانی ہی انسان کو اس مشکل سفر میں کامیابی سے ہم کنار کر سکتی ہے۔ لہٰذا انسان کو صرف اللہ کی مہربانی سے ہی اُمید رکھنی چاہیے کیوں کہ سب کچھ اللہ کی مہربانی پر موقوف ہے۔ داغ دہلوی کا کہنا ہے:

اُمید اس کی ذات سے اے داغ چاہیے
سب منحصر ہے رحمتِ پروردگار پر

ہر مسلمان کا یہ عقیدہ ہے کہ صرف اللہ کی مدد اور معاونت ہی اُسے منزل تک لے جاتی ہے۔ اگرچہ انسان کو وہی کچھ ملتا ہے جس کے لیے وہ کوشش کرتا ہے لیکن کوششیں کرنے کے لیے اگر توفیق الٰہی میسر نہ ہو تو انسان نہ تو کوئی کوشش کر سکتا ہے اور نہ ہی اُس کی کوئی کوشش اُسے کامیابی سے ہم کنار کر سکتی ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کی عظمت ہے کہ وہ نیکی کی توفیق بھی دیتا ہے اور نیکی کرنے پر انعام بھی عطا کرتا ہے۔ غرض دنیا و آخرت کا ہر کام اللہ ہی کی مرضی اور چاہت کے مطابق ہونا ہے۔ ابراہیم ذوق کا کہنا ہے:

www.pakcity.org www.pakcity.org

www.pakcity.org www.pakcity.org www.pakcity.org

جو کچھ ہوا، ہوا کرم سے تیرے
جو کچھ ہوگا، ترے کرم سے ہوگا

دنیا و آخرت میں انسان کو جو بھی ملتا ہے وہ اللہ ہی کی رحمت و مہربانی کی وجہ سے ملتا ہے۔ لہٰذا انسان کو اللہ کی مہربانی کی اُمید رکھنی چاہیے۔ ارشادِ ربانی ہے: لا تقنطوا من رحمة اللّٰه o ''اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہو۔'' مختصر یہ ہے کہ آخرت کے سفر میں انسان کا کوئی بھی رہنما یا دوست نہیں ہے بلکہ اللہ ہی کی مہربانی ہے جو اُسے منزل تک پہنچا سکتی ہے۔ اکبر الہ آبادی کا کہنا ہے:

تیری معین فقط ہے خدا کی ذات اے دوست
خدا گواہ کہ پکی یہی ہے بات اے دوست

یا بقول میرؔ:

میرؔ بندوں سے کام کب نکلا
مانگنا ہے جو کچھ خدا سے مانگ

(بورڈ 2018,19ء)

شعر نمبر 4:

سفر ہے شرط، مسافر نواز بہتیرے
ہزارہا شجرِ سایہ دار، راہ میں ہے

تشریح: خواجہ حیدر علی آتشؔ کا شمار اردو ادب کے مشہور غزل گو شعرا میں ہوتا ہے۔ غمِ عشق، غمِ زمانہ اور آفاقی موضوعات پر مشتمل آتشؔ کے اشعار زندگی کی حقیقتوں کے ترجمان بھی ہیں اور معاملاتِ محبت کے عکاس بھی۔

زیرِ تشریح شعر میں آتشؔ کہتے ہیں کہ ''سفر ضروری ہے۔ مسافر نواز بہت ہیں (مثلاً) راستے میں ہزاروں سایہ دار درخت موجود ہیں۔''

عربی زبان کا مشہور مقولہ ہے '' السفر وسيلة الظفر'' (سفر کامیابی کا وسیلہ ہے)۔ دنیا کی عظیم ہستیوں کے حالاتِ زندگی سے معلوم ہوتا ہے کہ اُنھوں نے اپنی زندگی میں کئی سفر کیے ہیں اور اُن کی تاریخی کامیابیاں سفر ہی کی مرہونِ منت ہیں۔ حضرت محمد رسول اللہ خاتم النبیین ﷺ نے بھی اپنی زندگی میں کئی سفر کیے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سے صرف چند صحابہ رضی اللہ عنہم کی قبریں مدینہ میں ہیں۔ سفر انسان کی کامیابی کے لیے انتہائی ضروری چیز ہے۔ لہٰذا انسان کو زندگی میں سفر کرتے رہنا چاہیے۔ عدمؔ کا کہنا ہے:

قدم دھیرے دھیرے اُٹھاتے چلو
سفر کو سیاحت بناتے چلو

کسی بھی سفر پر جانے سے قبل انسان بہت سے خدشات اور گھبراہٹ کا شکار ہو جاتا ہے۔ اُسے ایک فکر یہ بھی ہوتی ہے کہ گھر سے دور اجنبی جگہ پر اُس کا مددگار یا مسافر نواز نہیں ہوگا۔ اسی لیے انسان عام طور پر سفر کرنے سے پہلے گھبراتا ہے اور وہ بہت سے سفر اس لیے نہیں کر پاتا کیوں کہ وہ ان دیکھی مشکلات سے ڈرتا ہے۔ شاعر حفیظؔ جالندھری کا کہنا ہے:

ارادے باندھتا ہوں ، سوچتا ہوں، توڑ دیتا ہوں
کہیں ایسا نہ ہو جائے، کہیں ایسا نہ ہو جائے

انسان کی ہمیشہ یہ کوشش ہوتی ہے کہ اُسے سفر نہ کرنا پڑے جہاں وہ ہوتا ہے، وہیں رہنا چاہتا ہے کیوں کہ راستے کی مشکلات انسان کو سفر کے ارادے سے روکتی ہیں۔ انسان کو سفر سے پہلے اس طرح کے خدشات کا شکار نہیں ہونا چاہیے بلکہ انسان کو چاہیے کہ وہ سفر کا آغاز کر دے کیوں

www.pakcity.org www.pakcity.org

www.pakcity.org www.pakcity.org www.pakcity.org

کہ قدرت کی طرف سے مسافروں کی مدد کرنے کو بہت سی چیزیں موجود ہوتی ہیں۔ اگر انسان منزل کی سمت چلتا رہے تو اُسے مختلف طرح سے مدد ملتی رہتی ہے۔ جس طرح راستے پر جلتی دھوپ میں ہزاروں درخت اپنی چھاؤں سے مسافروں کے لیے سفر میں آسانی پیدا کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ حبیب جالبؔ کا کہنا ہے:

آساں تھا سفر کہ ہر اک راہ گزر پر
ملتے تھے سایہ دار شجر اُس دیار میں

سفر سے مراد کسی ''نظریے پر چلنا'' بھی ہوسکتا ہے۔ ایک نظریاتی شخص کو اپنے نظریات پر چلتے ہوئے بے شمار مسائل اور مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور شروع میں اُسے تنہا ہی اپنے نظریات کا پرچار کرنا ہوتا ہے۔ بسا اوقات لوگ اپنے نظریات پر چلتے ہوئے پیش آنے والی تکلیفوں کی وجہ سے نظریے سے پیچھے ہٹ جاتے ہیں۔ آتشؔ کا یہ کہنا ہے کہ انسان کو گھبراہٹ اور تکلیفوں کی وجہ سے اپنے نظریات کو نہیں چھوڑنا چاہیے بلکہ اُسے منزل کی جانب گامزن رہنا چاہیے۔ بصورت دیگر انسان کوئی بڑی منزل حاصل نہیں کرسکتا۔ اقبال رحمۃ اللہ علیہ کا کہنا ہے:

چلنے والے نکل گئے ہیں
جو ٹھہرے ذرا کچل گئے ہیں

آتشؔ ہمارا حوصلہ بڑھاتے ہیں کہ ڈرنے کی ضرورت نہیں۔ مایوس ہونے کی ضرورت نہیں اگر انسان پکا ارادہ کرلے تو پھر اللہ تعالیٰ بھی مہربانی کرتا ہے اور مسافر کی مدد کے بہت سے وسیلے پیدا کردیتا ہے۔ زندگی کے بارے میں یہ امید افزا رویّہ اختیار کرکے ہی انسان کامیابی کی سیڑھیاں چڑھ سکتا ہے۔ انسان کی زندگی میں رُکاوٹ نہیں ہونا چاہیے کیوں کہ حیاتِ انسانی ذوقِ سفر کے سوا کچھ بھی نہیں ہے۔ اقبال رحمۃ اللہ علیہ کا کہنا ہے:

ہر اک مقام سے آگے مقام ہے تیرا
حیات ذوقِ سفر کے سوا کچھ اور نہیں

شعر نمبر 5:

مقام تک بھی ہم اپنے، پہنچ ہی جائیں گے
خدا تو دوست ہے، دشمن ہزار، راہ میں ہے

تشریح: خواجہ حیدر علی آتشؔ کا شمار اردو ادب کے مشہور غزل گو شعرا میں ہوتا ہے۔ غمِ عشق، غمِ زمانہ اور آفاقی موضوعات پر مشتمل آتشؔ کے اشعار زندگی کی حقیقتوں کے ترجمان بھی ہیں اور معاملاتِ محبت کے عکاس بھی۔

زیرِ تشریح شعر میں آتشؔ کہتے ہیں کہ ''ہم اپنی منزل تک پہنچ ہی جائیں گے کیوں کہ خدا ہمارا دوست ہے اگرچہ راہ میں ہزاروں دشمن ہیں۔''

زندگی میں انسان کا سامنا ہزاروں دُشمنوں سے ہوتا ہے۔ قدرت نے ہر انسان کے ساتھ شیطان کی صورت میں واضح دُشمن لگا رکھا ہے۔ تاریخ گواہ ہے کہ ہر اچھے انسان کو دنیا میں بہت سے دُشمنوں کا سامنا کرنا پڑا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو فرعون، حضرت ابراہیم علیہ السلام کو نمرود اور حضرت محمد رَّسُولُ اللّٰہِ خَاتَمُ النَّبِیّٖنَ صلی اللہ علیہ وآلہ واصحابہ وسلم کو ابولہب و ابوجہل نے بہت تکلیفیں پہنچائیں مگر چوں کہ اللہ تعالیٰ کی مدد اُن کے شاملِ حال تھی اس لیے کوئی بھی اُن کا بال بیکا نہیں کرسکا۔ ارشادِ ربانی ہے:

الیس اللّٰہُ بکافٍ عبدَہ ○ (کیا اللہ اپنے بندے کو کافی نہیں)

اسی طرح انسان جب سفر پر روانہ ہوتا ہے تو اُسے راستے میں موجود مشکلات، سفر کی مصیبتوں اور راستے پر گھات لگائے ہوئے دشمنوں

www.pakcity.org www.pakcity.org

www.pakcity.org www.pakcity.org www.pakcity.org

سے ڈر محسوس کرتا ہے لیکن انسان اگر اللہ پر بھروسہ کرتے ہوئے اللہ کو دوست مان لے تو انسان تو کوئی دشمن اُس کا بال بیکا نہیں کر سکتا اور وہ ہزار ہا رکاوٹوں اور دُشمنوں کے باوجود بخیر و عافیت اپنی منزل تک پہنچ سکتا ہے۔ آتش کا کہنا ہے:

مہرباں ہو دوست، زور دُشمن کا چل سکتا نہیں
آتشِ نمرود ہے گلزار، ابراہیم علیہ السلام کو

وہ افراد جو اللہ تعالیٰ کی رحمت سے مایوس نہیں ہوتے، جو اُس پر مکمل بھروسہ کرتے ہیں، جو صرف زبان ہی سے یہ نہیں کہتے کہ ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھی سے مدد چاہتے ہیں بلکہ عملاً بھی اس پر کاربند ہوتے ہیں تو اللہ تعالیٰ انھیں بے سہارا نہیں چھوڑتا بلکہ ہر مصیبت میں ان کا ہاتھ تھام لیتا ہے۔ آتش کا موقف بھی یہی ہے کہ اگرچہ راستے میں دشمن بھی موجود ہیں لیکن خدا ہمارا دوست ہے تو آخر کار ہم منزل تک رسائی حاصل کر لیں گے۔ اکبر الہ آبادی کا کہنا ہے:

اے دوست مجھے تو ہے خدا ہی پر بھروسہ
دُشمن کو مبارک ہو مری گھات میں رہنا

آتش کا موقف یہ ہے کہ انسان کو دنیا میں دُشمنوں سے ڈرنا نہیں چاہیے بلکہ اُسے اللہ پر توکل اور بھروسہ کرنا چاہیے کیوں کہ اللہ کی مرضی کے بغیر دُشمن انسان کا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکتا اور جب اللہ انسان کے دوست بن جائیں تو انسان کا کسی کی دُشمنی سے کچھ بھی نہیں ہو سکتا۔ داغ دہلوی کا کہنا ہے:

خدا جب دوست ہے اے داغ! دُشمن سے کیا اندیشہ
ہمارا کچھ کسی کی دُشمنی سے ہو نہیں سکتا

شعر نمبر 6:

تھکیں جو پاؤں تو چل سر کے بل، نہ ٹھہر آتش
گلِ مراد ہے منزل میں، خار راہ میں ہے

مفہوم:

آتش! اگر پاؤں تھک جائیں تو سر کے بل چلو کیوں کہ راستے میں مشکلات تو ہیں مگر منزل پر پہنچ کر آرام نصیب ہوگا۔

☆☆☆☆☆

www.pakcity.org www.pakcity.org

www.pakcity.org www.pakcity.org www.pakcity.org

حیدر علی آتشؔ (غزل نمبر 2)

شعر نمبر 1: (بورڈ 2017,18,22ء)

یہ آرزو تھی تجھے گُل کے روبرو کرتے
ہم اور بلبل بے تاب گفتگو کرتے

تشریح: خواجہ حیدر علی آتشؔ کا شمار اردو ادب کے مشہور غزل گو شعرا میں ہوتا ہے۔ غمِ عشق، غمِ زمانہ اور آفاقی موضوعات پر مشتمل آتشؔ کے اشعار زندگی کی حقیقتوں کے ترجمان بھی ہیں اور معاملاتِ محبت کے عکاس بھی۔

زیرِ تشریح شعر میں آتشؔ کہتے ہیں کہ ''اے محبوب! ہماری خواہش تھی کہ ہم تجھے گلاب کے پھول کے سامنے لاتے اور پھر ہم اور بُلبل بے تاب گفتگو کرتے۔''

محبت کرنے والے اپنی محبت اور اپنے محبوب کا موازنہ دوسروں سے کرنے کی خواہش رکھتے ہیں۔ محبت کرنے والا محبت کی سرشاری میں یہ سمجھتا ہے کہ اس کے محبوب سے زیادہ حسین اور کوئی ہستی نہیں ہو سکتی۔ چوں کہ بلبل کو پھول کا؛ پروانے کو شمع کا اور قمری کو سرو کا عاشق قرار دیا جاتا ہے۔ اس لیے ہر عاشق کی طرح بلبل کو بھی اپنے محبوب یعنی پھول کی خوب صورتی کا دعویٰ ہوتا ہے۔ مگر ہمارے محبوب کے حُسن کے سامنے حُسن کے دعوے داروں کو منھ کی کھانی پڑتی ہے۔ میرؔ کا کہنا ہے:

چمن میں گُل نے جو کل دعوی جمال کیا
جمالِ یار نے منھ اُس کا خوب لال کیا

آتشؔ کی آرزو یہ ہے کہ ایک طرف تو ہم اپنے محبوب کو پھول کے سامنے کرتے اور دوسری طرف ہم اور بلبل گفتگو کرتے۔ یعنی دونوں عاشق ایک طرف اور دونوں محبوب ایک طرف ہو جاتے۔ پھر ہماری اور بلبل کی گفتگو شروع ہو جاتی۔ بلبل پھول کا حُسن، دل کشی، خوب صورتی، رنگت، نزاکت اور خوش بو بیان کرتی اور ہم محبوب کو پھول کے سامنے کر دیتے تو محبوب کا خوب صورت اور بے داغ چہرہ سامنے آتے ہی پھول کو شرمندگی کا سامنا کرنا پڑتا۔ آتشؔ کا کہنا ہے:

رخِ بے داغ دکھلایا تو ہوتا
گل و لالہ کو شرمایا تو ہوتا

یا میرؔ کا کہنا ہے:

بلبل نے سمجھ کے کیا تجھے نسبت دی
گل سے ہزار پردہ تُو ہے نازک

جب پھول کھلتے ہیں تو بلبل اپنی دلکش آواز میں چہچہاتے ہوئے دراصل پھولوں کا حسن بیان کرتی ہے۔ بلبل کو خوش آواز پرندہ سمجھا جاتا ہے۔ پھولوں کے حسن کے ساتھ ساتھ بلبل کی خوش الحانی بھی باغ کی خوب صورتی کو چار چاند لگاتی ہے۔ لیکن اگر ہماری بلبل سے محبوب کے حسن پر گفتگو ہو تو ہم بلبل کو وہ سبق سکھا دیں کہ بلبل ہمارے سامنے پھول کے حُسن کے ساتھ ساتھ اپنی دل کش آواز بھی بھول جائے۔ میرؔ کا کہنا ہے:

بلبل غزل سرائی آگے ہمارے مت کر
سب ہم سے سیکھتے ہیں انداز گفتگو کا

www.pakcity.org www.pakcity.org

www.pakcity.org www.pakcity.org www.pakcity.org

یہ ایک حقیقت ہے کہ جس کا محبوب جتنا زیادہ حسین ہوتا ہے اُسے اُتنا ہی زیادہ بے قراری و بے چینی کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ چناں چہ آتش اس آرزو کا اظہار کر رہے ہیں کہ ہم محبوب اور پھول کو روبرو کر کے بلبل سے اپنی بے چینی اور بے تابی بیان کرتے۔ غرض بلبل پھول کی عارضی زندگی اور اپنی بے چینی اور بے تابی بیان کرتی اور ہم اپنی بے چینی اور بے تابی بیان کرتے۔ اکبر الہ آبادی نے اسی طرح کا مضمون اپنے مشہور شعر میں یوں بیان کیا ہے۔

؎ آ عندلیب! مل کے کریں آہ و زاریاں
تُو ہائے گل پکار میں چلاؤں ہائے دل

شعر نمبر 2: (بورڈ 2009,13,17,18,22ء)

پیام بر نہ میسر ہوا تو خوب ہوا
زبانِ غیر سے کیا شرحِ آرزو کرتے

تشریح: خواجہ حیدر علی آتش کا شمار اردو ادب کے مشہور غزل گو شعرا میں ہوتا ہے۔ غمِ عشق، غمِ زمانہ اور آفاقی موضوعات پر مشتمل آتش کے اشعار زندگی کی حقیقتوں کے ترجمان بھی ہیں اور معاملاتِ محبت کے عکاس بھی۔

زیرِ تشریح شعر میں آتش کہتے ہیں کہ ''ہمیں کوئی پیغام پہنچانے والا نہیں ملا تو یہ بہت اچھا ہوا کیوں کہ ہم اپنی آرزو کی وضاحت دوسروں کی زبان سے کیسے کراتے۔''

اللہ تعالیٰ نے انسان کو جن نعمتوں سے نوازا ہے ان میں سے ایک اہم نعمت قوتِ اظہار بھی ہے کہ انسان جو کچھ سوچتا ہے اسے لفظوں کی صورت دے سکتا ہے۔ افراد کے درمیان اگر محبت کا تعلق موجود ہو تو انسان اپنی دلی کیفیات محبوب تک پہنچانا چاہتا ہے۔ انسان جب براہِ راست محبوب سے بات نہ کر سکتا ہو تو اسے پیام بر کے وسیلے کی ضرورت ہوتی ہے۔ داغ دہلوی کا کہنا ہے:

؎ مجھ کو ہے اپنے نامہ بر کی تلاش
نامہ بر کو ہے اُن کے گھر کی تلاش

آتش کا موقف یہ ہے کہ ہمیں محبوب تک پیغام پہنچانے کے لیے کوئی نامہ بر یا پیام بر نہیں ملا تو یہ اچھا ہوا کیوں کہ کسی بیگانے کی زبان سے ہماری محبت کا ذکر ہو یہ اچھا نہیں لگتا۔ اردو شاعری میں نامہ بر کو شک کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ اگر ایک نامہ بر عاشق کا پیغام لے کر جائے تو اس بات کا امکان باقی رہتا ہے کہ نامہ بر حقیقت کے برعکس غلط بیانی سے کام لیتے ہوئے اپنا کوئی ذاتی فائدہ اُٹھا لے۔ داغ دہلوی کا کہنا ہے:

؎ نامہ بر ایک بھی سچا نہیں دیکھا ہم نے
سیکڑوں مفت کے نام لیے جاتے ہیں

درحقیقت محبوب سے گفتگو اور بات چیت کا اپنا ہی لطف اور مزہ ہوتا ہے۔ اگر محبوب سے گفتگو نامہ بر کی وساطت سے ہوگی تو گفتگو کا لطف اور مزہ نامہ بر لے جائے گا اور عاشق اپنی کہانی اپنی زبانی سنانے کا مزہ حاصل نہیں کر سکے گا۔ داغ دہلوی کا کہنا ہے:

؎ نامہ بر نے طے کیے سارے پیام
منھ زبانی کا مزہ جاتا رہا

محبوب صرف الفاظ کے ذریعے گفتگو نہیں کرتا بلکہ محبوب کی ایک ایک ادا میں عاشق کے لیے سو سو پیغام موجود ہوتے ہیں اور عاشق محبوب کی اداؤں میں اُس کے کئی جواب بھانپ لیتا ہے۔ اگر نامہ بر کی وساطت سے محبوب تک پیغام پہنچایا جائے تو نامہ بر محبوب کی اداؤں کو نہیں سمجھتا۔

www.pakcity.org www.pakcity.org

www.pakcity.org www.pakcity.org www.pakcity.org

یوں وہ محبوب کے کئی جوابات بھی نہیں سمجھ پاتا اور پیغامِ محبت ادا کرنے سے قاصر رہتا ہے۔ مومن خان مومنؔ کا کہنا ہے:

؎ ایک ایک ادا سو سو جواب دیتی ہے اُس کا
کیوں کر لبِ قاصد سے پیغام ادا ہوتا

خواجہ میر دردؔ کا کہنا ہے:

؎ قاصد نہیں یہ کام ترا، اپنی راہ لے
اُس کا پیام دل کے سوا کون لا سکے؟

اصل میں محبت ایسا جذبہ ہے کہ انسان اس بات سے ڈرتا ہے کہ کہیں اس جذبے کو، اس رشتے کو نظر نہ لگ جائے۔ آتشؔ یہ نہیں چاہتے کہ وہ کسی بیگانے کے سامنے اپنے دل کا راز کھولیں کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ بات کوئی دوسرا رخ اختیار کر لے اور وہ بیگانہ بھی محبوب کا دیوانہ اور ہمارا رقیب بن جائے۔ غالبؔ نے اس مضمون کو اس طرح بیان کیا:

؎ ذکر اس پری وش کا اور پھر بیاں اپنا
بن گیا رقیب آخر تھا جو رازداں اپنا

شعر نمبر 3: (بورڈ 2018ء)

؎ مری طرح سے مہ و مہر بھی ہیں آوارہ
کسی حبیب کی یہ بھی ہیں جستجو کرتے

تشریح: خواجہ حیدر علی آتشؔ کا شمار اردو ادب کے مشہور غزل گو شعرا میں ہوتا ہے۔ غمِ عشق، غمِ زمانہ اور آفاقی موضوعات پر مشتمل آتشؔ کے اشعار زندگی کی حقیقتوں کے ترجمان بھی ہیں اور معاملاتِ محبت کے عکاس بھی۔

زیرِ تشریح شعر میں آتشؔ کہتے ہیں کہ ''سورج اور چاند بھی میری طرح گردش میں ہیں انھیں بھی کسی محبوب کی تلاش ہے۔''

کائنات کی ہر شے دوست کی تلاش میں سرگرداں دکھائی دیتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے تمام مخلوق کو جوڑوں کی صورت میں پیدا کیا ہے اور انسان جو اشرف المخلوقات ہے جسے اللہ نے زمین پر اپنا جانشین بنا کر بھیجا ہے اس کی ضروریات کی نوعیت ایسی ہے کہ انسان تنہا رہ کر وہ ضروریات پوری نہیں کر سکتا۔ چناں چہ وہ اپنے جیسے انسانوں کے ساتھ مل جل کر زندگی گزارتا ہے۔ انسان کا لفظی معنی ہے محبت کرنے والا۔ انسان جس سے محبت کرتا ہے اس کی جستجو اور تلاش میں وہ جگہ جگہ بھٹکتا پھرتا ہے۔ یہاں تک کہ محبوب کو ڈھونڈتے ڈھونڈتے انسان خود کو کھو بیٹھتا ہے۔ میرؔ کا کہنا ہے:

؎ اُسے ڈھونڈتے میرؔ کھوئے گئے
کوئی دیکھے اس جستجو کی طرف

عاشق چاہے معاشرے کا معمولی فرد ہو یا مشہور و معروف شخصیت اُسے محبوب کی تلاش اور جستجو رہتی ہے۔ عشق میں یہ خاصیت ہے کہ عاشق کو محبوب کی جستجو اور تلاش میں گلی گلی، کوچہ کوچہ اور نگر نگر آوارہ بھٹکنا پڑتا ہے۔ داغؔ دہلوی کا کہنا ہے:

؎ عشقِ خانہ خراب کے ہاتھوں
دربدر شہریار پھرتے ہیں

جس طرح عاشق محبوب کی تلاش میں دربدر بھٹکتا رہتا ہے، دیکھا جائے تو اُسی طرح سورج اور چاند بھی گردش میں ہیں۔ سورج اپنے مدار

www.pakcity.org www.pakcity.org

www.pakcity.org www.pakcity.org www.pakcity.org

میں گردش کرتا ہے اور چاند ہلال سے بدر اور بدر سے ہلال کا سفر طے کرتا ہے۔ چناں چہ آتش کا موقف یہ ہے کہ چاند اور سورج کو گردش کرتے دیکھ کر یوں لگتا ہے جیسے وہ بھی میری طرح کسی دوست کی تلاش میں ہیں۔ گویا کائنات کی کوئی شے بھی تنہا نہیں رہنا چاہتی۔ ہر کسی کو ایک دوست کی ضرورت ہوتی ہے۔ آتش کا کہنا ہے:

ترے جویا ہیں محبوب یہ بھی
پھرا کرتے ہیں گھر گھر چاند سورج

تشریح طلب شعر میں آتش سورج اور چاند کو خود سے تشبیہ دے رہے ہیں کیوں کہ سورج اور چاند بھی اپنے اپنے مدار پر چکر کاٹ رہے ہیں اور عاشق بھی محبوب کی تلاش اور جستجو میں آوارہ رہتا ہے اور در بدر چکر کاٹتا رہتا ہے۔ معلوم یہ ہوتا ہے کہ سورج اور چاند بھی کسی کی جستجو اور تلاش میں ہیں۔ علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی ایک نظم میں چاند کو مخاطب کرتے ہوئے کیا خوب کہا ہے:

میں مضطرب زمیں پر، بے تاب تُو فلک پر
تجھ کو بھی جستجو ہے، مجھ کو بھی جستجو ہے

داغ دہلوی کا کہنا ہے:

تلاشِ یار میں چھوڑی نہ سرزمیں کوئی
ہمارے پاؤں میں چکر ہے آسماں کی طرح

شعر نمبر 4: (بورڈ 2017,22ء)

ہمیشہ میں نے گریباں کو چاک چاک کیا
تمام عمر رفوگر رہے رفو کرتے

تشریح: خواجہ حیدر علی آتش کا شمار اردو ادب کے مشہور غزل گو شعرا میں ہوتا ہے۔ غمِ عشق، غمِ زمانہ اور آفاقی موضوعات پر مشتمل آتش کے اشعار زندگی کی حقیقتوں کے ترجمان بھی ہیں اور معاملاتِ محبت کے عکاس بھی۔

زیرِ تشریح شعر میں آتش کہتے ہیں کہ ''میں نے ہمیشہ اپنا گریباں تار تار کیا اور تمام عمر رفوگر رفو کرتے رہے۔''

محبت کرنے والے کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ اس کا محبوب اس کی نظروں کے سامنے رہے۔ جوں جوں محبت بڑھتی ہے محبوب کو دیکھنے کی خواہش میں اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ لیکن جب محبت کرنے والا اپنے محبوب کو نہ دیکھ سکے تو وہ اداس ہو جاتا ہے۔ خاص طور پر جب بہار کے موسم میں ہر طرف پھول کھلے ہوتے ہیں، ماحول خوش گوار ہوتا ہے تو محبوب کی کمی کا احساس شدت اختیار کر جاتا ہے اور اُس کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ اس خوش گوار ماحول میں محبوب بھی اُس کے ساتھ ہو۔ مگر جب محبوب اُس کے پاس نہیں ہوتا تو انسان گھٹن محسوس کرنے لگتا ہے اور اس پر جنوں کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے اور اسی کیفیت میں وہ اپنا گریباں چاک کر دیتا ہے۔ خواجہ میر درد کا کہنا ہے:

اپنے ہاتھوں کے بھی میں زور کا دیوانہ ہوں
رات دن کشتی ہی رہتی ہے گریباں کے ساتھ

ہر عاشق کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ اُس کا محبوب اُس کے ساتھ ہو۔ عاشق کی اس خواہش کے برعکس جب محبوب عاشق سے بے رُخی و بے اعتنائی سے پیش آتا ہے تو عاشق کے لیے یہ کیفیت انتہائی تکلیف دہ ہوتی ہے۔ یہاں تک کہ ایک موقع یہ آتا ہے کہ وہ جنون، دیوانگی، پاگل پن اور وحشت کا شکار ہو جاتا ہے اور اُس کے پاس گریباں چاک کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں رہتا۔ میر تقی میر کا کہنا ہے:

www.pakcity.org

www.pakcity.org

www.pakcity.org www.pakcity.org www.pakcity.org

اُن نے کھینچا ہے مِرے ہاتھ سے داماں اپنا
کیا کروں گر نہ کروں چاک گریباں اپنا

آتش کا موقف یہ ہے کہ میرے دوست میرا پھٹا گریباں ہمیشہ سینے کی کوشش کرتے رہے لیکن میرے جنون کی شدت میں کمی واقع نہ ہوئی اور میں ہمیشہ اپنا گریباں تار تار کرتا رہا۔ چوں کہ جنون کے ہاتھوں چاک شدہ دامن محبوب کی محبت کی نشانی ہے اسی لیے میری یہ خواہش ہے کہ اِسے رفو نہ کیا جائے۔ عدم کا کہنا ہے:

چاک دامن مِرا رفو نہ کرو
یہ کسی دوست کی نشانی ہے

اردو شاعری کی یہ روایت ہے کہ محبت کرنے والے جنون اور وحشت کا شکار ہو کر جب اپنا دامن چاک چاک کرتے ہیں تو عام طور پر اُن کے دوست واحباب کی یہ کوشش ہوتی ہے کہ اُن کا گریباں سلامت رہے۔ لیکن صرف ظاہری آثار دور کرنے سے کبھی کوئی مسئلہ دور نہیں ہوا کرتا بلکہ مسئلہ اسی وقت حل ہوتا ہے جب اس کے اسباب دور کیے جائیں۔ جب تک محبت کرنے والے کو اس کا محبوب نہ ملے تو فقط گریباں سینے سے مسئلہ حل نہیں ہوسکتا اور جب محبوب ہی نہ ہو تو عاشق دوستوں کی چارہ گری سے بے پروا ہوتا ہے اور اس کی یہی خواہش ہوتی ہے کہ اُس کے دوست اُسے اُس کے حال پر چھوڑ دیں۔ داغ دہلوی کا کہنا ہے:

چارہ گر مرتے ہیں کیوں تدبیر پر
چھوڑ دیں مجھ کو مِری تقدیر پر

آتش کا موقف یہ ہے کہ عاشق کا چاک ہوا گریباں رفو گر رفو تو کر لیتے ہیں لیکن اس سے عاشق کی وحشت، جنون اور دیوانگی میں کمی نہیں آتی اور وہ اپنا گریباں چاک چاک کرتا رہتا ہے۔ دوست غم خواری میں عاشق کے زخموں پر مرہم لگا کر علاج کی کوشش کرتے رہتے ہیں اور عاشق جنون میں اپنے زخم نوچتا رہتا ہے۔ غالب کا کہنا ہے:

دوست غم خواری میں مِری سعی فرمائیں گے کیا
زخم کے بھرنے تلک ناخن نہ بڑھ آئیں گے کیا

شعر نمبر 5:

نہ پوچھ عالمِ برگشتہ طالعی آتش
برستی آگ جو باراں کی آرزو کرتے

مفہوم:

اے آتش ہماری بدقسمتی کا کچھ مت پوچھو کہ اگر ہم بارش کی دعا مانگیں تو آسمان سے آگ برسنے لگے۔

☆☆☆☆☆

www.pakcity.org www.pakcity.org

www.pakcity.org www.pakcity.org www.pakcity.org

میرزا خان داغ دہلوی (غزل نمبر 1)

مشکل الفاظ وتراکیب کی تفہیم

الفاظ	مفہوم
نامہ بر	قاصد، خط لے جانے والا
اجل	موت
عدو	دشمن
نہیں کھیل	کوئی کھیل نہیں، کوئی آسان کام نہیں
گو	اگرچہ
خاطر	لحاظ، پاسداری
چمن	باغ
تاب وتواں	طاقت، حوصلہ، صبر وتحمل
آشیاں	گھونسلا
عنسان	ویران
افشائے راز	راز ظاہر ہو جانا

شعر نمبر 1: (بورڈ 2008)

پھرے راہ سے وہ یہاں آتے آتے
اجل مر رہی تو، کہاں آتے آتے

تشریح: داغ دہلوی اردو ادب کے معروف غزل گو شاعر تھے۔ غمِ جاناں اور غمِ دوراں پر مبنی داغ کے اشعار معاملاتِ محبت کے ترجمان بھی ہیں اور زندگی کی حقیقتوں کے عکاس بھی۔ ان کے بعض اشعار ضرب المثل کی حیثیت اختیار کر چکے ہیں۔

زیرِ تشریح شعر میں داغ کہتے ہیں کہ ''محبوب میری طرف آتے آتے راستہ بدل گیا۔ اے موت تو کہاں مر گئی ہے تو ہی آ جا۔''

انسانی فطرت ہے کہ انسان جس ہستی سے محبت کرتا ہے اسے اپنی نظروں کے سامنے موجود دیکھنا چاہتا ہے۔ جوں جوں وابستگی بڑھتی ہے اسی اعتبار سے دیکھتے رہنے کی خواہش بھی بڑھ جاتی ہے۔ لیکن اگر محبوب نظروں کے سامنے موجود نہ ہو تو انسان انتظار کرتا ہے خاص طور پر جب محبوب عاشق سے ملاقات کا وعدہ کرتا ہے تو عاشق رات بھر محبوب سے ملاقات کے مقررہ وقت کا بڑی بے چینی، بے قراری اور شدت سے قیامت خیز انتظار کرتا رہتا ہے۔ داغ دہلوی کا کہنا ہے:

www.pakcity.org www.pakcity.org www.pakcity.org

غضب کیا تیرے وعدے پہ اعتبار کیا
تمام رات قیامت کا انتظار کیا

داغؔ کی شاعری میں محبوب کو طعن و تشنیع اور اس کی وعدہ خلافیوں کا تذکرہ کثرت سے ملتا ہے۔ محبوب عام طور پر عاشق سے ملاقات کا وعدہ تو کرتا ہے لیکن عین وقت پر وہ وعدہ خلافی کر جاتا ہے۔ محبوب کے سارے وعدے جھوٹے ہوتے ہیں اور وہ کوئی وعدہ وفا نہیں کرتا۔ داغؔ دہلوی کا کہنا ہے:

نہ کیا وعدہ رات کا پورا
تُو نہیں اپنی بات کا پورا

میرزا داغؔ دہلوی کا موقف یہ ہے کہ محبوب ہماری طرف آتے ہوئے راستے سے واپس چلا گیا اور ہم تنہا رہ گئے ہیں۔ ہماری بے چینی اور بے قراری میں اتنا اضافہ ہو گیا ہے کہ جینا محال ہو گیا ہے۔ کاش تنہائی کے اس عالم میں جب میدان خالی ہے تو موت ہی آ جاتی۔ محبوب کو روکنے والے تو بہت تھے۔ وہ خود بھی محبت کرنے والوں پر سختی کرتا ہے لیکن موت کو تو روکنے والا کوئی نہیں تھا کاش ایسے میں موت ہی آ جاتی۔ آتشؔ کا کہنا ہے:

وہ جانِ جاں نہیں آتا تو موت ہی آتی
دل و جگر کو کہاں تک بھلا لہو کرتے

اکبرالہ آبادی کا کہنا ہے:

بٹھا رکھا ہے اُس نا مہرباں نے منتظر کر کے
خدا سے ہے مجھے اُمید اُٹھا لے مہرباں ہو کر

داغؔ موت سے مخاطب ہو کر یہ کہہ رہے ہیں کہ اے موت تُو کہاں مر گئی ہے۔ آج تنہائی کے اس عالم میں جب بے چینی و بے تابی حد سے تجاوز کر گئی ہے تو موت بھی نہیں آ رہی۔ افسوس ناک بات یہ ہے کہ ایک طرف تو محبوب بھی نہیں آ رہا اور دوسری طرف موت بھی نہیں آ رہی۔ ہماری بے چینی اور بے قراری کے خاتمے کی دو ہی صورتیں ہیں کہ محبوب آ جائے یا ہم دنیا سے چلے جائیں مگر افسوس کہ نہ تو محبوب آ رہا ہے اور نہ ہم (دُنیا سے) جا رہے ہیں۔ عدمؔ کا کہنا ہے:

قیامت کا بازار کیا گرم ہوگا
نہ ہم جا رہے ہیں نہ تم آ رہے ہو

شعر نمبر 2:

نہ جانا کہ دنیا سے جاتا ہے کوئی
بہت دیر کی مہرباں آتے آتے

تشریح: داغؔ دہلوی اردو ادب کے معروف غزل گو شاعر تھے۔ غمِ جاناں اور غمِ دوراں پر مبنی داغؔ کے اشعار معاملاتِ محبت کے ترجمان بھی ہیں اور زندگی کی حقیقتوں کے عکاس بھی۔ ان کے بعض اشعار ضرب المثل کی حیثیت اختیار کر چکے ہیں۔

زیرِ تشریح شعر میں داغؔ کہتے ہیں کہ ''میرے مہربان! تم نے آنے میں تاخیر کرتے ہوئے یہ نہیں سوچا کہ اس دوران میں کوئی دنیا سے

www.pakcity.org

www.pakcity.org

www.pakcity.org www.pakcity.org www.pakcity.org

چلا جائے گا۔"

وقت گزر جانے کے بعد کسی کے کام آنے کی کوشش کرنا بے کار ہوتا ہے۔ کسی بھی فرد کی، اس کے فیصلے کی، اس کے رویے کی اہمیت اور قدر و قیمت کا انحصار وقت اور زمانے کے اعتبار سے ہوتا ہے جب کسی شے کی ضرورت ہو اور وہ میسر نہ ہو تو انسان اس کے حصول کے لیے کوشش کرتا ہے، دعا کرتا ہے، انتظار کرتا ہے جب وہ ضرورت ختم ہو جائے تو پھر مطلوبہ شے کا ہونا یا نہ ہونا برابر ہو جاتا ہے۔ انسانی زندگی جب تک ہو اسی وقت تک چیزوں کی اہمیت بھی اس کے لیے ہوتی ہے جب زندگی ہی نہ رہے تو پھر ہر شے بے معنی ہو جاتی ہے۔ میرزا داغ دہلوی کا موقف یہ ہے کہ محبوب ہماری جاں نکلنے کے بعد آ تو گیا ہے لیکن اُس نے یہ نہ سوچا کہ جتنی تاخیر میں کر رہا ہوں اس میں کسی کی جان بھی جا سکتی ہے۔ لہٰذا جان جانے کے بعد محبوب کا آنا بے معنی و بے سود ہے۔ غالب کا کہنا ہے:

؎ کی میرے قتل کے بعد اس نے جفا سے توبہ
ہائے اس زود پشیماں کا پشیماں ہونا

عاشق زندگی بھر محبوب کا انتظار کرتا رہتا ہے۔ اُسے عشق و محبت میں کئی تکالیف کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ عشق و محبت کی تکالیف اور پریشانیاں جھیلتے جھیلتے جب وہ دنیا سے چلا جاتا ہے تو محبوب کو اُس کی موت پر افسوس، ندامت اور پچھتاوا ہوتا ہے۔ یعنی زندگی بھر تو محبوب عاشق کے پاس آتا نہیں لیکن موت کے وقت ندامت اُسے کھینچ لاتی ہے مگر اُس وقت بہت دیر ہو چکی ہوتی ہے۔ داغ دہلوی کا کہنا ہے:

؎ مر چلے ہم، تو رحم کرنے لگے
اب جو کرتے ہو، پیشتر نہ کیا

حسرت موہانی کا کہنا ہے:

؎ وہ آئے مگر آئے کس وقت حسرت
کہ ہم چل بسے مرحبا کہتے کہتے

داغ کا موقف یہ ہے کہ محبوب مہربان تو ہوا لیکن اتنی تاخیر سے کہ ہم دنیا میں نہ رہے۔ اس میں ایک طرح کا طنز ہے کہ ایسی مہربانی کس کام کی جو انسان کی زندگی میں نہ ہو بلکہ مرنے کے بعد ہو۔ محبت کرنے والے عام طور پر محبوب کے مہربان ہونے کی خواہش لیے ہی دنیا سے رخصت ہو جاتے ہیں۔ داغ کے یہاں محبت کرنے والے کی طرف سے محبوب کی لاپروائی کا احساس بھی ملتا ہے کہ محبوب کو یہ خیال ہی نہیں کہ اس کی تاخیر کے باعث کوئی دنیا سے چلا جائے گا۔ یا یوں کہیے کہ محبوب کو اس بات کی پروا نہیں کہ اس کی بے رخی سے کوئی جیتا ہے یا مرتا ہے اور موت کے بعد محبوب کو اس بات پر پشیمانی ہوتی ہے۔ مگر جب تک عاشق زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھتا ہے۔ مومن خان مومن کا کہنا ہے:

؎ وہ آئے ہیں پشیماں لاش پر اب
تجھے اے زندگی لاؤں کہاں سے

داغ کا موقف یہ ہے کہ عاشق کو زندگی بھر محبوب سے ملاقات کا انتظار رہتا ہے۔ لیکن جب وہ بالآخر اس جہان سے چلا جاتا ہے تو پھر محبوب ندامت و پشیمانی کے ساتھ عاشق کی قبر پر آتا ہے۔ لیکن موت کے بعد محبوب کا آنا بے سود ہوتا ہے۔ شاعر کا کہنا ہے:

؎ مرنے کے بعد آئے وہ مرے مزار پر
پتھر پڑیں صنم تیرے ایسے پیار پر

www.pakcity.org

www.pakcity.org

www.pakcity.org www.pakcity.org www.pakcity.org

شعر نمبر 3:

سنانے کے قابل جو تھی بات ان کو
وہی رہ گئی درمیاں آتے آتے

تشریح: داغؔ دہلوی اردو ادب کے معروف غزل گو شاعر تھے۔ غمِ جاناں اور غمِ دوراں پر مبنی داغؔ کے اشعار معاملاتِ محبت کے ترجمان بھی ہیں اور زندگی کی حقیقتوں کے عکاس بھی۔ ان کے بعض اشعار ضرب المثل کی حیثیت اختیار کر چکے ہیں۔

زیرِ تشریح شعر میں داغؔ کہتے ہیں کہ ''محبوب سے ملاقات کے وقت جو بات اُسے سنانے کے قابل تھی وہ درمیان میں ہی رہ گئی۔''

انسان بعض اوقات غیر ضروری باتیں تو کرتا رہتا ہے لیکن جو بات کرنا چاہتا ہے وہ لفظوں کا روپ نہیں دھار سکتی۔ اظہار کی صلاحیت اللہ تعالیٰ کی ان نعمتوں میں ایک بڑی نعمت ہے جن کا ذکر وہ سورۃ الرحمٰن میں کرتا ہے۔ ''اُس نے انسان کو بیان سکھایا''۔ بعض اوقات انسان بہت سی باتیں کہہ نہیں پاتا، اس لیے کہ کہیں ان کا غلط مطلب نہ لیا جائے۔ چناں چہ داغؔ کے معاملہ بندی کے اس شعر میں بھی ایسی ہی صورت حال کا تذکرہ کیا گیا ہے کہ محبوب سے ملاقات سے قبل تو محبوب سے دل کی بات کرنے کی خواہش تھی۔ لیکن محبوب سے ملاقات کے وقت اُس سے دل کی بات نہیں ہو سکی۔ میرؔ کا کہنا ہے:

؎ کہتے تو ہو یوں کہتے، یوں کہتے، جو وہ آتا
یہ کہنے کی باتیں ہیں، کچھ بھی نہ کہا جاتا

عاشق محبوب کے سامنے اپنے دل کی بات کئی وجوہات کی بنا پر نہیں کر پاتا۔ سب سے بڑی وجہ تو یہ ہے کہ عاشق محبوب کو دیکھتے ہی ہوش و حواس کھو بیٹھتا ہے اور اس کے حُسن و جمال میں کچھ اس طرح ڈوب جاتا ہے کہ اُسے کوئی بات بھی یاد نہیں رہتی۔ میرؔ کا کہنا ہے:

؎ ہوش جاتا نہیں رہا لیکن
جب وہ آتا ہے تب نہیں آتا

ایک اور بڑی وجہ جس بنا پر عاشق اپنے محبوب سے دل کی بات نہیں کر پاتا یہ ہے کہ اُسے ڈر ہوتا ہے کہ کہیں محبوب انکار نہ کر دے اور محبوب سے تعلقات بالکل ہی منقطع نہ ہو جائیں۔ اسی طرح ایک وجہ یہ بھی ہوتی ہے کہ دورانِ ملاقات محبوب عاشق سے گلے شکوے اور شکایتیں شروع کر دیتا ہے اور عاشق کو اپنے دل کی بات کرنے کا موقع نہیں دیتا۔ دراصل انسان اپنے دل کی بات بتانے کے لیے کسی موزوں وقت اور موقع کی تلاش میں ہوتا ہے۔ لیکن دورانِ ملاقات محبوب کے شکوہ و شکایت کی وجہ سے عاشق کو اس بات کا موقع ہی نہیں ملتا کہ وہ اپنے دل کی بات اپنی زبان پر لا سکے اور عاشق کے دل کی بات درمیان میں ہی رہ جاتی ہے۔ داغؔ دہلوی کا کہنا ہے:

؎ شکایت حکایت ہی میں رات گزری
رہے تذکرے درمیاں کیسے کیسے

اکبرؔ الہ آبادی کا کہنا ہے:

؎ جرأت عرضِ حال کیا ہوتی
نظرِ لطف اُس نے کی ہی نہیں

انسانی فطرت یہ ہے کہ جو بات جتنی ضروری ہو اس کے اظہار میں انسان اتنی ہی عجلت کرتا ہے کہ جتنی جلدی ممکن ہو ضروری بات کہہ دی

www.pakcity.org www.pakcity.org

www.pakcity.org www.pakcity.org www.pakcity.org

جائے لیکن محبت کے معاملات بھی عجیب ہوتے ہیں کہ انسان ادھر ادھر کی غیر ضروری باتیں تو کرتا رہتا ہے لیکن اصل بات کہنے سے ہچکچاتا رہتا ہے۔ داغؔ کا موقف یہ ہے کہ ایسا نہیں کہ ہمارے اور اس کے درمیان بات چیت نہ ہوتی ہو۔ باتیں تو ہوئیں لیکن جو بات اسے بتانا ضروری تھا وہ نہیں بتائی جا سکی۔ مومن خان مومنؔ کا کہنا ہے:

؎ یہ حالت ہے تو کیا حاصل بیاں سے
کہوں کچھ اور کچھ نکلے زباں سے

شعر نمبر 4:

میرے آشیاں کے تو تھے چار تنکے
چمن اڑ گیا آندھیاں آتے آتے

تشریح: داغؔ دہلوی اردو ادب کے معروف غزل گو شاعر تھے۔ غمِ جاناں اور غمِ دوراں پر مبنی داغؔ کے اشعار معاملاتِ محبت کے ترجمان بھی ہیں اور زندگی کی حقیقتوں کے عکاس بھی۔ ان کے بعض اشعار ضرب المثل کی حیثیت اختیار کر چکے ہیں۔

زیرِ تشریح شعر میں داغؔ کہتے ہیں کہ ''آندھیوں کی زد میں آ کر فقط میرا بسیرا ہی تباہ نہیں ہوا، پورے کا پورا باغ اجڑ گیا ہے۔''

انسان بیک وقت دو سطحوں پر زندگی بسر کرتا ہے۔ ایک اس کی ذاتی زندگی اور دوسری اجتماعی زندگی۔ بعض معاملات اور واقعات ایسے ہوتے ہیں جو کسی ایک فرد کے ساتھ پیش آتے ہیں اور جس کا ردِ عمل اس کی شخصیت پر اثر انداز ہوتا ہے لیکن سماجی زندگی گزارتے ہوئے انسان اجتماعی صورت حال سے لاتعلق نہیں رہ سکتا چناں چہ معاشرے میں انسان کے اردگرد ہونے والے واقعات انسان کی نجی زندگی کو بھی اثر انداز کرتے ہیں۔ میرزا خان داغؔ بھی اپنی تباہی اور بربادی کا ذکر کرتے ہوئے یہ کہہ رہے ہیں کہ میرا آشیانہ آندھیوں کی زد میں آ کر تباہ ہو گیا ہے۔

؎ آشاؤں کے تنکے چن چن کے سپنوں کا محل سجایا تھا
طوفاں سے تنکے بکھر گئے، کوئی یہاں گرا کوئی وہاں گرا

امیرؔ مینائی کا کہنا ہے:

؎ جب سے بُلبل تُو نے دو تنکے لیے
ٹوٹتی ہیں بجلیاں ان کے لیے

داغؔ کی زندگی کے ابتدائی ایام کا مطالعہ کیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ ان کی ذاتی زندگی میں کچھ صدمات ایسے آئے جو اس وقت کے معاشرے کو اجتماعی سطح پر بھی اثر انداز ہو رہے تھے اور یہ ۱۸۵۷ء کے حالات تھے کہ جب دہلی پر انگریزوں کی حکومت قائم ہو گئی تو داغؔ کے والد کو ایک انگریز کو قتل کرنے کے جرم میں پھانسی دے دی گئی۔ نوعمری ہی میں داغؔ یتیم ہوئے اور ان کا گھر اجڑ گیا دوسری طرف دہلی شہر دارالحکومت ہونے کی وجہ سے تباہ و برباد ہو گیا۔ انگریز دور میں بے شمار لوگوں کو سزائے موت ہوئی لوگوں کے گھر گرا دیے گئے، اُنھیں جیل بھیج دیا گیا اور اُن پر طرح طرح کے ظلم ڈھائے گئے۔ لوگوں کو کالے پانی کی سزا دی گئی۔ یعنی ایک طرف تو داغؔ کی ذاتی زندگی تباہی کا شکار تھی اور دوسری طرف اجتماعی زندگی بھی انگریز کے مظالم کی وجہ سے بدحال ہو کر رہ گئی تھی۔ چناں چہ داغؔ کا موقف یہ ہے کہ مجھے اپنی تباہی سے زیادہ ملک کی تباہی کا رنج اور دُکھ ہے۔ اقبالؔ رحمۃ اللہ علیہ کا کہنا ہے:

www.pakcity.org www.pakcity.org

www.pakcity.org www.pakcity.org www.pakcity.org

مرا رونا نہیں، رونا ہے یہ گلستاں کا
وہ گل ہوں میں، خزاں ہر گل کی ہے گویا خزاں مری

داغؔ کا موقف بھی یہی ہے کہ میرا گھر تو چند تنکوں پر مشتمل تھا۔ آندھی وطوفان کے سامنے زیادہ دیر قائم نہیں رہ سکتا تھا گویا اس نے تو برباد ہونا ہی تھا لیکن طوفان سے باغ بھی نہ بچ سکا یعنی اجتماعی حالات اس طرح بگڑے کہ ہر شے تہ و بالا ہوگئی۔ درحقیقت اس شعر میں ''چمن'' ملک کے لیے استعارہ ہے اور اسی طرح ''آندھیاں'' انگریز کے مظالم کے لیے استعارہ ہے۔ یعنی انگریز کے مظالم سے تو میرے گھر کے ساتھ ساتھ پورا ملک بھی تباہ ہو کر رہ گیا ہے۔ اس لیے مجھے اپنے گھر سے زیادہ ملک کی تباہی کا افسوس ہے۔ اکبرؔ الہ آبادی نے یہی مضمون اسی انداز میں کچھ یوں بیان کیا ہے:

کچھ نہ پوچھ اے ہم نشیں! میرا نشیمن تھا کہاں؟
اب تو یہ کہنا بھی مشکل ہے وہ گلشن تھا کہاں

شعر نمبر 5:

نہیں کھیل اے داغؔ یاروں سے کہہ دو
کہ آتی ہے اردو زباں آتے آتے

مفہوم:

اردو زبان سیکھنا بچوں کا کھیل نہیں ہے اس کے لیے خاصی محنت کرنا پڑتی ہے۔

☆☆☆☆☆

www.pakcity.org
EDUCATION
pakcity.org

www.pakcity.org www.pakcity.org www.pakcity.org

میرزا خان داغؔ دہلوی (غزل نمبر 2)

شعر نمبر 1:

خاطر سے یا لحاظ سے میں مان تو گیا
جھوٹی قسم سے آپ کا ایمان تو گیا

تشریح: داغؔ دہلوی اردو ادب کے معروف غزل گو شاعر تھے۔ غمِ جاناں اور غمِ دوراں پر مبنی داغؔ کے اشعار معاملاتِ محبت کے ترجمان بھی ہیں اور زندگی کی حقیقتوں کے عکاس بھی۔ ان کے بعض اشعار ضرب المثل کی حیثیت اختیار کر چکے ہیں۔

زیرِ تشریح شعر میں داغؔ کہتے ہیں کہ ''میں نے تو آپ کا دل رکھنے کی خاطر آپ کی بات مان لی لیکن جھوٹی قسم سے آپ کا ایمان تو چلا گیا۔''

محبت کرنے والے محبوب کی خوشی کی خاطر اس کی ہر بات پر یقین کر لیتے ہیں اور بعض اوقات محبوب کو جتا بھی دیتے ہیں کہ تم نے جو کچھ کہا غلط کہا۔ واقعہ یہ ہے کہ محبوب عاشق کا دل رکھنے کے لئے اس سے کئی وعدے کرتا ہے، کئی قسمیں کھاتا ہے لیکن محبوب کوئی وعدہ پورا نہیں کرتا اور نہ ہی اسے اپنی کسی قسم کا لحاظ ہوتا ہے۔ داغؔ کے اس شعر میں بھی محبوب کی جھوٹی قسموں کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ داغؔ نے اپنی شاعری میں اپنے مخصوص انداز میں محبوب کی جھوٹی قسموں کا کثرت سے تذکرہ کیا ہے۔ انھیں محبوب سے یہ شکوہ ہے کہ ان کا محبوب بات بات پر قسمیں تو بہت کھاتا ہے لیکن ایک قسم بھی پوری نہیں کرتا۔ داغؔ کا کہنا ہے:

؎ اے لبِ یار! تجھ کو میری قسم
کبھی سچی قسم بھی کھائی ہے؟

داغؔ اپنے ایک اور شعر میں محبوب کی جھوٹی قسموں کا اپنے مخصوص انداز میں یوں ذکر کرتے ہیں:

؎ جھوٹی قسمیں بہت ہیں کھانے کو
مرے مرنے کا غم وہ کھائیں کیوں

محبوب جب عاشق سے جھوٹے وعدے کرتا ہے اور جھوٹی قسمیں کھاتا ہے تو عاشق محبوب کی خاطر اور اس کا لحاظ کرتے ہوئے اس پر یقین کر لیتا ہے۔ عاشق کو محبوب کی ان جھوٹی قسموں کا بخوبی علم ہوتا ہے لیکن وہ پھر بھی محبوب کی باتوں پر یقین کر لیتا ہے۔ دراصل عاشق کو محبوب کی ہر بات پر محبوب کی خاطر یقین کرنا ہوتا ہے چاہے وہ قسم کھائے یا نہ کھائے۔ چناں چہ داغؔ کا یہ کہنا ہے کہ محبوب آپ کو جھوٹی قسمیں کھا کر اپنے ایمان سے ہاتھ دھونے کی کی ضرورت نہیں ہے ہم تو آپ پر آپ کی خاطر اور آپ کا لحاظ رکھتے ہوئے آپ کی بات کا اعتبار کر لیتے ہیں۔ داغؔ اپنے ایک اور شعر میں یہی مضمون کچھ اس طرح بیان کرتے ہیں:

؎ خدا کے واسطے جھوٹی نہ کھایئے قسمیں
مجھے یقین ہوا مجھے اعتبار آیا

داغؔ کا موقف یہ ہے کہ میں آپ کا دل رکھنے کے لیے آپ کی بات مان گیا ہوں لیکن جھوٹی قسم کھانے پر آپ کو دوہرا نقصان ہوا کہ ایک تو آپ نے جھوٹ بولا اور گناہ حاصل کیا دوسرا جھوٹی قسم کھانے سے آپ اپنے ایمان سے محروم ہو گئے۔ انسانی رشتہ اعتماد کی فضا میں ہی برقرار رہ سکتا ہے۔ جھوٹ بول کر، دھوکا دے کر کبھی بھی کوئی رشتہ برقرار نہیں رکھا جا سکتا۔ وجہ یہ ہے کہ جب بھی حقیقت ظاہر ہوتی ہے، سچائی سامنے آتی

www.pakcity.org www.pakcity.org

www.pakcity.org www.pakcity.org www.pakcity.org

ہے تو انسان کے دل میں اس شخص کی اہمیت ختم ہو جاتی ہے جو اسے دھوکا دیتا رہا ہو، جو اس سے جھوٹ بولتا چلا آیا ہو۔ داغؔ اسی بنیادی حقیقت کی طرف ہمیں متوجہ کرتے ہیں کہ جھوٹ زیادہ عرصہ چھپا نہیں رہ سکتا۔ اس نے تو ظاہر ہونا ہی ہوتا ہے اور اس کا نتیجہ بھی ظاہر ہے کہ جھوٹے انسان کا اعتبار ہمیشہ کے لیے ختم ہو جاتا ہے۔ داغؔ دہلوی کا کہنا ہے:

جو تمھاری طرح تم سے کوئی جھوٹے وعدے کرتا
تمھیں منصفی سے کہہ دو، تمھیں اعتبار ہوتا؟

شعر نمبر 2:

دل لے کے مفت کہتے ہیں کچھ کام کا نہیں
الٹی شکایتیں ہوئیں احسان تو گیا

تشریح: داغؔ دہلوی اردو ادب کے معروف غزل گو شاعر تھے۔ غمِ جاناں اور غمِ دوراں پر مبنی داغؔ کے اشعار معاملاتِ محبت کے ترجمان بھی ہیں اور زندگی کی حقیقتوں کے عکاس بھی۔ ان کے بعض اشعار ضرب المثل کی حیثیت اختیار کر چکے ہیں۔

زیرِ تشریح شعر میں داغؔ کہتے ہیں کہ انھیں مفت میں ہمارا دل مل گیا تو کہتے ہیں کہ یہ دل ہمارے کسی کام کا نہیں ہے۔ ہمارا احسان ماننے کے بجائے وہ شکایتیں کرتے ہیں۔''

یوں تو دنیا میں انسان لوگوں کو کئی تحفے دیتا ہے لیکن انسان اپنی زندگی کا سب سے قیمتی تحفہ دل کی صورت میں محبوب کی نذر کر دیتا ہے۔ دل کا یہ نذرانہ اور تحفہ دیتے وقت عاشق کو کسی بدلے کی خواہش نہیں ہوتی وہ اپنی سب سے قیمتی چیز یعنی دل مفت میں محبوب کو دے دیتا ہے۔ داغؔ نے اپنے ایک اور شعر میں یہی بات کچھ یوں بیان کی ہے:

دیا مفت دل داغؔ نے اس پری کو
نہیں کوئی نادان انسان سے بڑھ کر

محبت اک ایسا جذبہ ہے کہ جس میں محبت کرنے والا دل کی صورت میں اپنا سب سے قیمتی اثاثہ محبوب کو مفت میں سونپ دیتا ہے اور اسے بدلے کی کوئی تمنا نہیں ہوتی یوں مفت دل دے کر انسان محبوب پر ایک احسان کرتا ہے۔ داغؔ کا کہنا ہے:

دل دیتے ہیں لو مفت ہی کیا یاد کرو گے
احسان جو مانو گے تو آئے گی وفا یاد

مشہور مقولہ ہے ''مالِ مفت دلِ بے رحم''۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ انسان کو جو شے بغیر کچھ خرچ کیے مل جائے انسان کے نزدیک اس کی اہمیت کچھ نہیں ہوتی۔ داغؔ کا یہ کہنا ہے کہ ہمارے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی ہوا کہ ہم نے محبوب کو دل پیش کیا تو اس نے مفت کا مال سمجھتے ہوئے ہمارے دل کی کوئی قدر نہیں کی بلکہ وہ بے نیازی اور بے رخی سے بولنے لگے کہ آپ کا یہ دل ہمارے کسی کام کا نہیں ہے یعنی اہمیت دینے کی بجائے محبوب نے ہمارے دل کو نظر انداز کر دیا۔ چوں کہ اس پر اس کا کچھ خرچ نہیں ہوا تھا اس لیے ہمارا احسان ماننے کی بجائے وہ شکوہ و شکایت کرنے لگا ہے۔ محبوب کو محبت کرنے والوں کے جذبات و احساسات کا کوئی خیال نہیں ہوتا۔ وہ اپنی ذات میں مگن رہتا ہے۔ اس کے لیے کسی کا محبت بھرا دل کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔ داغؔ اپنے ایک اور شعر میں یہی مضمون کچھ اس طرح بیان کرتے ہیں:

ان کو پروا نہیں کیوں دل کے خریدار نہیں
مفت کے قصے ہی وہ دل لیا کرتے ہیں

www.pakcity.org www.pakcity.org

www.pakcity.org www.pakcity.org www.pakcity.org

خواجہ میر دردؔ کا کہنا ہے:

؎ دل لے گیا پر ایک نہ کی اس طرف نگاہ
ایسا تو دلبروں میں کوئی مفت بر نہیں

ہر انسان کی توقع یہ ہوتی ہے کہ جس طرح وہ دوسروں سے پیش آ رہا ہے جو جذبات یا احساسات وہ دوسروں کے لیے رکھتا ہے جواب میں اسے ویسا ہی رویہ ملے لیکن یہ بھی انسانی فطرت ہے کہ جو شے آسانی سے مل جائے یا مفت مل جائے انسان کے نزدیک اس کی قدر و قیمت زیادہ نہیں ہوتی وہ اس بات پر غور نہیں کرتا کہ اس کے پاس کتنی قیمتی چیز ہے یوں وہ بعض قیمتی اور اہم چیزوں کو نظر انداز کر دیتا ہے اور ان سے محروم بھی ہو جاتا ہے۔

داغؔ کا موقف یہ ہے کہ ہم نے اپنے محبوب کو دل دیا تو بجائے اس کے کہ وہ ہمارا احسان مانے کہ دل جیسی قیمتی چیز جو محبت کے جذبات سے بھرا ہوا ہے، اسے پیش کر دیا ہے الٹا وہ شکایتیں کرتا ہے کہ یہ دل ہمارے کسی کام کا نہیں ہے۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے کہ حسن سلوک کا بدلہ سوائے حسن سلوک کے اور کچھ نہیں ہے مگر محبوب احسان کا بدلہ احسان سے دینے کی بجائے اُلٹی شکایتیں کر رہا ہے۔ داغؔ دہلوی کا کہنا ہے:

؎ دعویٰ مہر و وفا پر وہ برا مان گئے
الٹے بدنام ہوئے، احسان کے احسان گئے

شعر نمبر 3: (بورڈ 2019ء)

ڈرتا ہوں دیکھ کر دلِ بے آرزو کو میں
سنسان گھر یہ کیوں نہ ہو مہمان تو گیا

تشریح: داغؔ دہلوی اردو ادب کے معروف غزل گو شاعر تھے۔ غمِ جاناں اور غمِ دوراں پر مبنی داغؔ کے اشعار معاملاتِ محبت کے ترجمان بھی ہیں اور زندگی کی حقیقتوں کے عکاس بھی۔ ان کے بعض اشعار ضرب المثل کی حیثیت اختیار کر چکے ہیں۔

زیرِ تشریح شعر میں داغؔ کہتے ہیں کہ ''اگر دل میں کوئی خواہش موجود نہ ہو تو اس کی مثال ایک ایسے گھر کی طرح ہے جو بے آباد ہو، جسے دیکھ کر ڈر لگتا ہے۔''

خواہش اور آرزو کا تعلق دو چیزوں سے ہوتا ہے ایک ضرورت اور دوسری ماحول۔ انسان کو جس چیز کی ضرورت ہوتی ہے اسے حاصل کرنے کی خواہش پیدا ہوتی ہے لیکن جب انسان گرد و پیش میں دوسرے لوگوں کے پاس مختلف چیزیں دیکھتا ہے تو اس کا بھی جی چاہتا ہے کہ اس کے پاس بھی یہ چیزیں ہوں۔ یہی خواہش یا آرزو انسان کو متحرک کرتی ہے کام کرنے اور جدوجہد کرنے پر اکساتی ہے۔ اگر دل سے آرزوئیں ختم ہو جائیں تو انسانی ارتقا رک جائے، سماجی سرگرمیاں معطل ہو جائیں۔ داغؔ کا موقف یہ ہے کہ ہمارے دل میں اب کوئی آرزو موجود نہیں ہے جس کی وجہ سے دل ویران ہو گیا ہے۔ دل سے آرزوؤں کا ختم ہو جانا مایوسی کی علامت ہے۔ بہادر شاہ ظفرؔ کا کہنا ہے:

؎ ان حسرتوں سے کہہ دو کہیں اور جا بسیں
اتنی جگہ کہاں ہے دلِ داغ دار میں

انسان کے دل میں کئی آرزوئیں اور امیدیں آباد ہوتی ہیں دل کا گھر انہی آرزوؤں کی وجہ سے آباد ہوتا ہے۔ گویا یہ آرزوئیں اور امیدیں دل کی نگری کی مہمان ہوتی ہیں اگر دل میں کوئی آرزو اور خواہش باقی نہ رہے تو دل کی مثال ایک ایسے سنسان گھر کی طرح ہے جس کا

www.pakcity.org www.pakcity.org

www.pakcity.org www.pakcity.org www.pakcity.org

مہمان چلا گیا ہو۔ داغؔ نے بے آرزو دل کو سنسان گھر سے تشبیہ دی ہے۔ دراصل انسان کے دل کا خزانہ یہی آرزوئیں ہوتی ہیں دل کی بقا امیدوں اور آرزوؤں کی بدولت ہے اگر یہ ختم ہو جائیں تو دل بے کار ہو جاتا ہے۔ داغؔ نے اپنے ایک شعر میں یہی بات سادہ لفظوں میں کچھ یوں بیان کی ہے:

؎ دلِ پر آرزو لٹا اے داغؔ
وہ خزانہ نظر نہیں آتا

ناصرؔ کاظمی نے بھی یہی مضمون اپنے ایک شعر میں کچھ اس طرح بیان کیا ہے:

؎ چلے دل سے امیدوں کے مسافر
یہ نگری آج خالی ہو رہی ہے

اصل میں جب انسان آرزوؤں سے ہاتھ دھو بیٹھتا ہے تو پھر اپنے آپ کو حالات کے رحم و کرم پر چھوڑ دیتا ہے اور اس کا فعال کردار ختم ہو جاتا ہے حالات کا دھارا اسے جس طرف لے جائے وہ اُسی طرف بہتا رہتا ہے۔ داغؔ کا یہ کہنا کہ آرزوؤں سے خالی دل کو دیکھ کر ڈر لگتا ہے۔ دل میں آرزو ہو تو انسان متحرک رہتا ہے اور بہتر سے بہترین کی جانب گامزن رہتا ہے۔ یہ تحریک اس کی کامیابی کا وسیلہ بنتی ہے لیکن جب انسان مایوس ہو جائے خواہش کرنا ہی چھوڑ دے تو پھر زندگی بے مقصد ہو جاتی ہے۔ اس کی ویرانی کو دیکھ کر خوف محسوس ہوتا ہے۔ مختصر یہ ہے کہ دل کا اصل خزانہ آرزوئیں اور تمنائیں ہیں اور دل کے گھر کی بقا انھی کی بدولت ہے اگر یہ آرزوئیں ختم ہو جائیں تو دل کا گھر بیاباں ہو جاتا ہے جس سے انسان کو ڈر محسوس ہونے لگتا ہے۔ داغؔ کا کہنا ہے:

؎ چھائی جاتی ہے کیسی وحشت
گھر بیابان ہوا جاتا ہے

(بورڈ 2019ء)

شعر نمبر 4:

افشائے رازِ عشق میں گو ذلتیں ہوئیں
لیکن اسے جتا تو دیا، جان تو گیا

تشریح: داغؔ دہلوی اردو ادب کے معروف غزل گو شاعر تھے۔ غمِ جاناں اور غمِ دوراں پر مبنی داغؔ کے اشعار معاملاتِ محبت کے ترجمان بھی ہیں اور زندگی کی حقیقتوں کے عکاس بھی۔ ان کے بعض اشعار ضرب المثل کی حیثیت اختیار کر چکے ہیں۔

زیرِ تشریح شعر میں داغؔ کہتے ہیں کہ ''عشق کا راز کھلنے پر بڑی ذلت برداشت کرنا پڑی لیکن اس طرح محبوب کو یہ علم تو ہو گیا کہ ہم اس سے محبت کرتے ہیں۔''

محبت کرنے والے کے لیے سب سے اہم بات محبوب تک اپنے دل کی بات پہنچانا ہوتا ہے۔ انسان جو کچھ محسوس کرتا ہے اس کا اظہار کرنا چاہتا ہے لیکن بعض اوقات معاشرتی قدریں اخلاقی ضابطے اس بات کی اجازت نہیں دیتے کہ انسان جو کچھ محسوس کر رہا ہے اس کا کھلم کھلا اظہار کرے ورنہ اکثر اوقات اسے مخالفت برداشت کرنا پڑتی ہے اور ذلتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ہمارے معاشرے میں محبت ایک ایسا جذبہ ہے جو فطری ہونے کے باوجود دوسروں سے چھپایا جاتا ہے اور اگر کوئی شخص اس کا اظہار کرے تو اسے پسندیدگی کی نظر سے نہیں دیکھا جاتا۔ اگرچہ عشق کا راز فاش ہونے سے انسان کو بہت سی رسوائیوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے لیکن پھر بھی یہ راز انسان اپنے قریبی یاروں کو بتا ہی دیتا ہے۔ داغؔ دہلوی کا کہنا ہے:

www.pakcity.org www.pakcity.org

www.pakcity.org www.pakcity.org www.pakcity.org

ہر چند ہے افشائے محبت میں خرابی
یاروں سے مگر آنکھ چرائی نہیں جاتی

انسان اپنے جس دوست کو عشق کا راز بتا دیتا ہے عام طور پہ وہ اس راز کو راز نہیں رکھ پاتا بلکہ آگے سنا دیتا ہے جس وجہ سے عشق کا یہ راز فاش ہو جاتا ہے۔ عشق کا راز فاش ہوتے ہی عاشق کو بہت سی ذلتوں اور رسوائیوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ہر طرف اس کی بدنامیوں کے چرچے ہونے لگتے ہیں۔ یہاں تک کہ اس کی رسوائیوں کا شور دور دور تک جا پہنچتا ہے۔ میرؔ نے کیا خوب کہا ہے:

اور یہ ماجرا ہوا مشہور
شور رسوائیوں کا پہنچا دُور

داغؔ کا موقف ہے کہ ہمارے عشق کا راز کھل گیا ہے جس کی وجہ سے ہمیں ہر طرف ذلیل اور رسوا ہونا پڑا ہے ہماری رسوائیوں کا یہ عالم ہے کہ ہر طرف ہماری بدنامی کی کہانیاں اور قصے سنائے جا رہے ہیں اور ہمیں بہت ذلت کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے ہم جدھر بھی جاتے ہیں وہاں ہم سے پہلے ہماری رسوائیوں کے قصے پہنچے ہوتے ہیں۔ داغؔ نے اپنے ایک اور شعر میں اپنے مخصوص انداز میں عشق میں ہونے والی رسوائی کا تذکرہ کچھ اس طرح کیا ہے۔

جب تیرے در سے اٹھا ، خلقت تماشائی ہوئی
پیچھے پیچھے داغؔ آگے آگے رسوائی ہوئی

داغؔ کا موقف یہ ہے کہ عشق کے راز فاش ہونا اور اس پر ذلت اٹھانا ایک لحاظ سے تو تکلیف دہ ہے لیکن اس کا ایک مثبت پہلو بھی ہے کہ ہمارے دل کا حال محبوب کو بھی معلوم ہو گیا۔ اس سے پہلے تو محبوب کو شاید یہ خبر ہی نہیں تھی کہ ہم بھی اس کے چاہنے والوں میں شامل ہیں لیکن عشق کا راز فاش ہونے سے اس تک یہ بات تو پہنچ گئی اور اسے معلوم ہو گیا کہ ہمارے دل میں اس کے لیے کتنی محبت ہے، کتنا خلوص ہے، کتنا پیار ہے اور کتنی وفاداری ہے۔ جب محبوب کو ہمارے عشق کا علم ہو گیا ہے، وہ جان گیا ہے تو عین ممکن ہے کہ وہ مان بھی جائے۔ داغؔ کا کہنا ہے:

اُن کے عاشق ہیں وہ جانیں کہ نہ جانیں ہم کو
یہ سمجھتے ہیں کہ جب جان گئے، مان گئے

شعر نمبر 5: (بورڈ 2019ء)

گو نامہ بر سے خوش نہ ہوا پر ہزار شکر
مجھ کو وہ میرے نام سے پہچان تو گیا

تشریح: داغؔ دہلوی اردو ادب کے معروف غزل گو شاعر تھے۔ غمِ جاناں اور غمِ دوراں پر مبنی داغؔ کے اشعار معاملاتِ محبت کے ترجمان بھی ہیں اور زندگی کی حقیقتوں کے عکاس بھی۔ ان کے بعض اشعار ضرب المثل کی حیثیت اختیار کر چکے ہیں۔

زیرِ تشریح شعر میں داغؔ کہتے ہیں کہ ''محبوب نامہ بر سے خوش نہیں ہوا مگر شکر ہے کہ وہ مجھے میرے نام سے پہچان تو گیا ہے۔''

انسان جب براہ راست محبوب سے بات نہ کر سکتا ہو تو اسے نامہ بر کے وسیلے کی ضرورت ہوتی ہے۔ انسان اپنے دل کی بات خط لکھ کر محبوب تک پہنچاتا ہے اردو شاعری میں خط اور نامہ بر کا تذکرہ کثرت سے ملتا ہے۔ قدیم دور میں یہ بہت ہوا کرتا تھا کہ انسان اپنے دل کی بات محبوب تک قاصد یا نامہ بر کے ذریعے خط لکھ کر پہنچایا کرتے تھے۔ غالبؔ کا کہنا ہے:

خط لکھیں گے گرچہ کچھ مطلب نہ ہو
ہم تو عاشق ہیں تمہارے نام کے

www.pakcity.org www.pakcity.org

www.pakcity.org www.pakcity.org www.pakcity.org

نامہ بر جب پیغامِ محبت محبوب تک لے جاتا ہے تو عام طور پر محبوب کو نامہ بر کا آنا اور عاشق کا یوں خط لکھنا اچھا نہیں لگتا بلکہ وہ اس بات کو سخت ناپسند کرتا ہے۔ بسا اوقات تو محبوب خط بغیر پڑھے ہی پھاڑ دیتا ہے اور بسا اوقات نامہ بر سے برے طریقے سے پیش آتے ہوئے اسے برا بھلا کہتا ہے۔ اردو شاعری میں یہ مضمون بھی کثرت سے ملتا ہے کہ جب بھی عاشق نامہ بر کے ذریعے یا خط کی زبانی محبوب سے اظہارِ محبت کرتا ہے، اپنا مطلب کھول کر بیان کرتا ہے تو محبوب اِس بات سے ناخوش نظر آتا ہے۔ آتش کا کہنا ہے:

؎ بند خط اس نے پھاڑ کر پھینکا
ہم نے جب کھول کر لکھا مطلب

اردو شاعری میں محبوب کی سنگدلی اور بے وفائی کا تذکرہ کثرت سے کیا جاتا ہے۔ انسان محبوب کو اپنے دل کی کیفیات جب نامہ بر کے ذریعے خط کی زبانی تفصیل سے لکھتا ہے تو محبوب کبھی تو اپنی فطری سنگ دلی کی بنا پر ان تفصیلات میں پڑنا گوارا نہیں کرتا اور کبھی اپنی ذات اور مصروفیات میں اس قدر مگن ہوتا ہے کہ وہ نامہ بھر کو اپنی مصروفیات کا بہانہ کرتے ہوئے خط پڑھنے اور اس کی تفصیلات میں اُلجھنے سے انکار کر دیتا ہے۔ داغ کا کہنا ہے:

؎ دیا نامہ بَر نے آکر یہ جواب
انھیں بات کرنے کی فرصت نہیں

؎ خط مرا پھینک دیا یہ کہہ کر
ہم سے دفتر نہیں دیکھا جاتا

اگرچہ محبوب کا نامہ بر سے ناخوش ہونا عاشق کے لیے بہت تکلیف دہ ہوتا ہے لیکن دیکھا جائے تو اس کا ایک مثبت پہلو یہ بھی نکلتا ہے کہ اس بہانے محبوب تک عاشق کے دل کی بات پہنچ جاتی ہے۔ داغ کا موقف یہ ہے کہ ہمارا خط لے کر نامہ بر محبوب تک پہنچا۔ جسے دیکھ کر اس نے خوشی کا اظہار نہیں کیا لیکن ہمیں اطمینان ہے کہ اس نے ہمارا نام تو پہچان لیا ہے۔ محبت کرنے والے کے لیے یہی بہت ہوتا ہے کہ محبوب اس کا نام سن کر اسے پہچان لے۔ کسی کو چاہنا یا نہ چاہنا انسان کا ذاتی فعل ہے۔ ایک فرد جب کسی کو چاہتا ہے تو اس کی خواہش یہ ہوتی ہے کہ اس کی چاہت رائیگاں نہ جائے بلکہ محبوب اس کی چاہت کا اثبات کرے کیوں کہ دوسری صورت میں انسان کو اپنی محنت ہی نہیں بلکہ اپنی جان بھی جاتے ہوئے محسوس ہوتی ہے۔ ایسے میں اگر محبوب محبت کرنے والے کا نام سن کر اسے پہچان لے تو یہی بات اس کے لیے خوش کا باعث بن جاتی ہے کہ محبوب نے لاتعلقی کا اظہار تو نہیں کیا۔ انسان کے لیے سب سے تکلیف دہ چیز لاتعلقی ہوتی ہے انسان دشمنی تو گوارا کر لیتا ہے لیکن لاتعلقی گوارا نہیں کرتا۔

؎ قطع کیجیے نہ تعلق ہم سے
کچھ نہیں ہے تو عداوت ہی سہی

شعر نمبر 6:

بزمِ عدو میں صورتِ پروانہ دل مرا
گو رشک سے جلا تیرے قربان تو گیا

تشریح: داغ دہلوی اردو ادب کے معروف غزل گو شاعر تھے۔ غمِ جاناں اور غمِ دوراں پر مبنی داغ کے اشعار معاملاتِ محبت کے ترجمان بھی ہیں اور زندگی کی حقیقتوں کے عکاس بھی۔ ان کے بعض اشعار ضرب المثل کی حیثیت اختیار کر چکے ہیں۔

www.pakcity.org www.pakcity.org

www.pakcity.org www.pakcity.org www.pakcity.org

زیرِ تشریح شعر میں داغ کہتے ہیں کہ ''دشمن کی محفل میں میرا دل پروانے کی طرح رشک سے جل گیا لیکن ترے قربان تو گیا۔''

ایک عاشق کے لئے سب سے تکلیف دہ بات یہ ہوتی ہے کہ جب اس کا محبوب غیروں کے ساتھ خوش گوار موڈ میں نظر آئے۔ انسان جب محبوب کو غیروں کی محفل میں دیکھتا ہے تو انسان رشک کے مارے جل جاتا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ انسان کا دل ہر وقت محبوب کو اپنی آنکھوں کے سامنے دیکھنا چاہتا ہے۔ جب محبوب غیر کی محفل میں جاتا ہے تو عاشق دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر محبوب کے پیچھے پیچھے غیر کی محفل میں پہنچ جاتا ہے۔ محبوب کی موجودگی سے غیر کی محفل عشق کا ایک میدان بن جاتی ہے جہاں عشق کا امتحان دینے کے لیے عاشق بھی غیروں کے شانہ بشانہ موجود ہوتا ہے۔ داغ دہلوی کا کہنا ہے:

؎ بزمِ دشمن میں لے چلا ہے دل
کیسے بے اختیار ہم بھی ہیں

؎ میں بھی جاتا ہوں ساتھ غیروں کے
دوست دشمن کا امتحاں ہے آج

غیروں کی اس بزم میں جب محبوب غیروں سے گرم جوشی سے پیش آتا ہے تو عاشق کے لیے یہ مرحلہ انتہائی تکلیف دہ ہوتا ہے۔ جب محبوب غیروں پر لطف و کرم کرتا ہے تو عاشق کے لیے یہ چیز جان لیوا ثابت ہوتی ہے۔ محبوب کو غیروں کے ساتھ دیکھ کر اس کا دل رشک کے انگاروں پر لوٹنے لگتا ہے اور اس کا کلیجہ چھلنی چھلنی ہو جاتا ہے۔ داغ نے اپنے مخصوص انداز میں یہی کیفیت اپنے ایک اور شعر میں یوں بیان کی ہے:

؎ ہاتھ منہ ان کا دھلایا غیر نے
ہاتھ اپنی جان سے دھوتے ہیں ہم

داغ دہلوی کا کہنا ہے:

؎ غیر نے مہندی لگائی اس کے ہاتھوں میں جو داغ
خون آنکھوں میں اتر آیا حنا کو دیکھ کر

اصل میں محبت جذبہ ہی ایسا ہے کہ جس میں شراکت برداشت کرنا ممکن نہیں ہوتا۔ انسان جس سے محبت کرتا ہے چاہتا ہے کہ وہ بھی فقط اسے ہی چاہے شاید اسی لیے بعض اوقات وہ محبت کرنے سے ڈرتا بھی ہے۔ چناں چہ عاشق غیروں کی محفل میں محبوب کو دیکھتا ہے تو وہ پروانے کی طرح جل جاتا ہے۔ جس طرح پروانے شمع کے گرد اکٹھے ہو کر اپنی جان قربان کر دیتے ہیں اسی طرح ایک عاشق بھی جب محبوب کو رقیب کے ساتھ دیکھتا ہے تو عاشق کے دل میں رقیب کے لیے رشک کا جذبہ موجود ہوتا ہے۔ عاشق محبوب کو دنیا کا سب سے بڑا خزانہ سمجھتا ہے اس لیے عاشق کو رقیب کی خوش قسمتی پر رشک آتا ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ محبوب کی محفل میں موجود ہر شخص رقیب پر رشک کرتا ہے۔ داغ دہلوی کا کہنا ہے:

؎ دیکھنا رشک اس کی محفل میں
ایک کو ایک کھائے جاتا ہے

داغ کا موقف یہ ہے کہ محبوب ہمارے دشمن کی محفل میں موجود تھا ہم بھی وہاں پہنچ گئے دشمن کی خوش قسمتی پہ ہمیں اتنا رشک آیا کہ ہم پروانے کی طرح جل کر قربان تو ہو گئے ہیں لیکن یہ اس لحاظ سے بہت اچھا ہوا ہے کہ ہم نے جان تو محبوب پر قربان کر دی ہے۔ اپنی جان قربان کرتے ہوئے ہم دشمن کی محفل میں وفاداری اور جانبازی کے امتحان میں دشمن سے بازی لے گئے ہیں۔ محبت میں محبوب پر قربان ہو جانے میں ہی

www.pakcity.org www.pakcity.org

www.pakcity.org www.pakcity.org www.pakcity.org

محبت کرنے والا اپنی کامیابی محسوس کرتا ہے۔ یوں محبوب کی محفل میں قربان ہو کے ہمیں اپنی زندگی کا مقصد حاصل ہو گیا ہے۔ حسرت موہانی کا کہنا ہے:

؎ مر مٹے تجھ پہ، ہو گیا حاصل
مدعا اپنی زندگانی کا

شعر نمبر 7:

ہوش و حواس و تاب و تواں، داغ! جا چکے
اب ہم بھی جانے والے ہیں سامان تو گیا

مفہوم:

لگتا ہے کہ موت قریب آ گئی ہے۔ دنیا سے ہماری رخصت کا وقت آ گیا ہے کیوں کہ نہ تو ہوش و حواس ٹھکانے پر ہیں اور نہ ہی پہلے جیسی توانائی باقی رہی ہے۔

☆☆☆☆☆

www.pakcity.org
EDUCATION
pakcity.org

www.pakcity.org www.pakcity.org

www.pakcity.org www.pakcity.org www.pakcity.org

مومن خان مومنؔ (غزل نمبر 1)

مشکل الفاظ وتراکیب کی تفہیم

الفاظ	مفہوم
اغیار	غیر
راحت فزا	راحت کو جنم دینے والا، راحت کا سبب بننے والا
حرف ناصح	نصیحت کرنے والے کی بات
مضطرب	بے چین، بے قرار
ٹھانی تھی	پکا ارادہ کیا تھا
ناچار	مجبور، بے بس
شاہد	گواہ
فصلِ گل	بہار کا موسم
مدعی	دعویٰ کرنے والا، رقیب
گل کھلنا	کوئی بالکل نئی بات ہو جانا
برقِ تبسم	ہنسی کی بجلیاں
سوئے دشت	جنگل کی طرف
ربط	تعلق، میل جول
بدعتی	بدعت کرنے والا، دین میں کوئی نئی بات نکالنے والا، فسادی، ظالم

شعر نمبر 1: (بورڈ 2007-2009-2010-2011)

اثر اس کو ذرا نہیں ہوتا
رنج، راحت فزا نہیں ہوتا

تشریح: حکیم مومن خان مومنؔ اردو کے مشہور غزل گو شاعر تھے۔ وہ غالبؔ کے ہم عصر اور دوست تھے۔ غمِ عشق اور غمِ زمانہ پر مبنی مومنؔ کے اشعار زندگی کی محبتوں کے عکاس بھی ہیں اور حقیقتوں کے ترجمان بھی۔

زیرِ تشریح شعر میں مومنؔ کہتے ہیں کہ ''محبوب کو کچھ اثر بھی نہیں ہے اور ہمارا غم ہمارے لیے آسودگی اور اطمینان کا باعث نہیں بنتا۔''

www.pakcity.org www.pakcity.org

www.pakcity.org www.pakcity.org www.pakcity.org

محبت کرنے والا محبوب کو حاصل کرنے اور متاثر کرنے کے لیے بہت سے قدم اُٹھاتا ہے۔ وہ بے لوث محبت، وفاداری، خلوص اور سچائی جیسی کئی خوبیوں سے سرشار ہوتا ہے۔ وہ آہ وزاری کرتا ہے، فریاد کرتا ہے، روتا دھوتا ہے لیکن اس کی آہ وزاری اور کسی کیفیت کا محبوب پر کوئی اثر نہیں ہوتا۔ یوں عاشق کے سارے ولولے، ساری فریادیں رائیگاں اور بے اثر رہتی ہیں۔ مومن نے اپنے ایک اور شعر میں یہی بات بڑے دردمندانہ لہجے میں یوں بیان کی:

؎ کیا کروں اللہ سب ہیں بے اثر
ولولہ کیا، نالہ کیا، فریاد کیا

اگر آہ وزاری اپنا اثر دکھا دے تو انسان اطمینان محسوس کرنے لگتا ہے۔ اس کے دکھ درد خوشی و مسرت میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔ لیکن عام طور پر ایسا ہوتا نہیں کہ محبوب پر محبت کرنے والوں کے رونے دھونے کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔ حالاں کہ غم ایک ایسا جذبہ ہے جو دوسروں کو بہت جلد متاثر کرتا ہے۔ محبوب کے متاثر نہ ہونے کا ایک سبب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اسے خیال ہو کہ محبت کرنے والوں کو کوئی دکھ نہیں۔ ان کا رونا دھونا محض دکھاوا ہے۔ چناں چہ وہ محبت کرنے والوں کی آہ وزاری کا کوئی اثر نہیں لیتا۔ اکبر الہ آبادی کا کہنا ہے:

؎ دم نکلتا ہے ہمارا، خبر ان کو نہیں کچھ
جاں جاتی ہے ہماری، اُنھیں معلوم نہیں

مومن خان مومنؔ کا موقف یہ ہے کہ اگر محبوب ہمارے رنج و غم سے متاثر ہو جاتا تو پھر یہ رنج رنج نہ رہتا بلکہ اطمینان قلب کا وسیلہ بن جاتا۔ اصل میں انسان جب کسی کے دکھ درد سے متاثر ہوتا ہے تو یہ اپنائیت کی دلیل ہوتی ہے۔ ایک طرح سے محبت کے تعلق کا اظہار ہوتا ہے۔ محبوب کا محبت کرنے والے کے رنج سے متاثر ہونا بالواسطہ اقرار محبت ہے۔ اگر یہ ہو جائے تو محبت کرنے والے کے لیے یہ رنج خوشی و اطمینان کا باعث بن جاتا ہے۔ لیکن افسوس ناک بات یہ ہے کہ ہمارے محبوب کو ہماری بربادی کی کوئی خبر نہیں ہے۔ ساحرؔ لدھیانوی کا کہنا ہے:

؎ تجھ کو خبر نہیں مگر اک سادہ لوح کو
برباد کر دیا تیرے دو دن کے پیار نے

تشریح طلب شعر کا دوسرا پہلو ہے کہ قدرت کا یہ اصول ہے کہ ہر مشکل کے بعد آسانی اور ہر رنج کے بعد راحت ہوتی ہے۔ ارشادِ ربانی ہے ''بے شک تکلیف کے ساتھ آسانی ہے۔ بے شک تکلیف کے ساتھ آسانی ہے۔'' انسان جب بہت تکلیفیں اُٹھا لیتا ہے تو خدا اُس کے لیے آسانی پیدا کر دیتے ہیں۔ مومن خان مومن کا موقف یہ ہے کہ ویسے تو رنج کے بعد راحت ہوتی ہے لیکن میں اتنا بدنصیب ہوں کہ ہزاروں تکلیفیں اُٹھانے کے باجود بھی میں محبوب کو متاثر نہیں کر سکا۔ یوں میرے دُکھوں کے بعد کوئی سُکھ نہیں ہے۔ حالاں کہ دنیا کا قاعدہ ہے کہ دُکھ کی دھوپ کے بعد سُکھ کا سایہ ہوتا ہے۔ ساحرؔ لدھیانوی کا کہنا ہے:

؎ صدیوں سے انساں یہ سُنتا آیا ہے
دُکھ کی دھوپ کے آگے سُکھ کا سایہ ہے

شعر نمبر 2: (بورڈ 2007,09,10,11,22ء)

ذکرِ اغیار سے ہوا معلوم
حرف ناصح بُرا نہیں ہوتا

تشریح: حکیم مومن خان مومنؔ اردو کے مشہور غزل گو شاعر تھے۔ وہ غالبؔ کے ہم عصر اور دوست تھے۔ غمِ عشق اور غمِ زمانہ پر مبنی مومنؔ کے اشعار

www.pakcity.org www.pakcity.org

www.pakcity.org www.pakcity.org www.pakcity.org

زندگی کی محبتوں کے عکاس بھی ہیں اور حقیقتوں کے ترجمان بھی۔

زیرِ تشریح شعر میں مومنؔ کہتے ہیں کہ ''غیروں کے ذکر سے یہ بات معلوم ہوئی کہ نصیحت کرنے والوں کی نصیحت بُری نہیں ہوتی۔''

انسان جب کسی شے کو چاہنے لگتا ہے تو اس کی تمام تر توجہ اس خاص چیز یا ہستی کی طرف ہو جاتی ہے اور رفتہ رفتہ اس کا دھیان باقی چیزوں سے ہٹنے لگتا ہے اور ایک مرحلہ ایسا بھی آ جاتا ہے جب انسان دنیا و مافیہا سے بے نیاز ہو جاتا ہے۔ یہ منزل دیوانگی کی منزل کہلاتی ہے اور کسی بھی شخص کے خیر خواہ نہیں چاہتے کہ یہ مرحلہ آ جائے چناں چہ وہ خیر خواہ ناصح انسان کو عشق سے باز رہنے اور حدِ اعتدال میں رہنے کی نصیحت کرتے ہیں۔ انسان کو اُس وقت یہ نصیحتیں اچھی نہیں لگتیں۔ حسرتؔ موہانی کا کہنا ہے:

؎ بھول جاؤں میں اُنھیں، ہو نہیں سکتا ناصح
آگ لگ جائیو ظالم تیرے سمجھانے کو

اردو شاعری میں ناصح کے کردار کو عام طور پر اچھا نہیں سمجھا گیا۔ لیکن مومن خان مومنؔ اس شعر میں نصیحت یا اُس کے مثبت پہلو کی طرف متوجہ کراتے ہیں کہ غیروں کے ذکر سے ہمیں اس بات کا علم ہوا کہ نصیحت بُری چیز نہیں ہوتی۔ ''ذکرِ اغیار'' سے مراد محبوب کی زبان سے غیروں کے تذکرے ہیں۔ محبت کرنے والوں کے لیے سب سے تکلیف دہ بات یہ ہوتی ہے کہ جب اُن کا محبوب اُن کے سامنے غیروں کے تذکرے کرتا ہے۔ خاص طور پر جب محبوب عاشق کے سامنے غیروں کی وفاداری اور خوبیاں بیان کرے تو عاشق کا کلیجا رشک سے جل جاتا ہے۔ داغؔ دہلوی کا کہنا ہے:

؎ غیر کا ذکرِ وفا اور ہمارے آگے
داغؔ اس بات سے جلتا ہے کلیجا کیسا

محبوب جب غیروں کی خوبیاں عاشق کے سامنے بیان کرے تو عاشق کے لیے یہ صورت حال اذیت ناک تو ہوتی ہی ہوتی ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ اگر محبوب عاشق کے سامنے ''غیر کا نام'' بھی لیتا ہے تو یہ بات بھی عاشق کو سخت ناگوار گزرتی ہے۔ محبوب چاہے غیروں کی بُرائیاں اور شکایتیں ہی کیوں نہ کرے عاشق تو محبوب کی زبان سے ''غیر کا نام'' برداشت نہیں کر سکتا۔ غالبؔ کا کہنا ہے:

؎ ہے مجھ کو تُجھ سے، تذکرۂ غیر کا گلا
ہر چند بر سبیلِ شکایت ہی کیوں نہ ہو

مومن خان مومنؔ کا موقف یہ ہے کہ جب ہم نے محبوب کی زبان سے غیروں کے تذکرے سُنے تو ہمیں اس حقیقت کا ادراک ہوا کہ نصیحت کرنے والوں کی عشق سے باز رہنے کی نصیحت بالکل بجا تھی۔ ''ذکرِ اغیار'' سے مراد اگر وہ باتیں لی جائیں جو محبوب غیروں سے کرتا ہے تو اس شعر کا مفہوم کچھ اس طرح سے ہوگا کہ جب غیروں کی زبان سے ہم نے محبوب کے گلے شکوے اور اپنی بُرائیاں سُنیں تو ہمیں یہ بات معلوم ہوئی کہ نصیحت کرنے والے ہم کو بالکل ٹھیک نصیحت کیا کرتے تھے۔ اگر ہم اُن کی نصیحت پر عمل کر لیتے تو آج ہمیں اس صورت حال کا سامنا نہ کرنا پڑتا۔

شعر نمبر 3: (بورڈ 2007-09-10-11-22)

؎ تم ہمارے کسی طرح نہ ہوئے
ورنہ دنیا میں کیا نہیں ہوتا

تشریح: حکیم مومن خان مومنؔ اردو کے مشہور غزل گو شاعر تھے۔ وہ غالبؔ کے ہم عصر اور دوست تھے۔ غمِ عشق اور غمِ زمانہ پر مبنی مومنؔ کے اشعار

زندگی کی محبتوں کے عکاس بھی ہیں اور حقیقتوں کے ترجمان بھی۔

www.pakcity.org www.pakcity.org

www.pakcity.org www.pakcity.org www.pakcity.org

زیرِ تشریح شعر میں مومنؔ کہتے ہیں کہ ''محبوب تم ہمارے کسی بھی طرح سے نہ ہوئے ورنہ دنیا میں تو سب کچھ ہوتا ہے۔''

کسی بھی مقصد کے حصول کے لیے سب سے پہلی رکاوٹ انسان کی اپنی ذات ہوتی ہے۔ اُس کی انا، اُس کی نفسیاتی شخصیت اُسے منزل سے دور کر دیتی ہے۔ بعض اوقات خواہش ہی ناممکن کی ہوتی ہے۔ بعض اوقات انسان اُس چیز کی خواہش کر بیٹھتا ہے جس کا اہل نہیں ہوتا۔ نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ انسان محرومی کا شکار ہو کر رہ جاتا ہے۔ مومن خان مومنؔ کا موقف یہ ہے کہ ہم نے محبوب کو حاصل کرنے کے لیے ہر طرح کی کوشش کی۔ مصائب اور تکالیف اُٹھائیں۔ ملامتوں اور طعنوں کا سامنا کیا۔ مر مر کے جیتے رہے اور جی جی کے مرتے رہے۔ در بدر ٹھوکریں کھائیں۔ دل لہو، جگر ٹکڑے ٹکڑے اور آنسو خون ہو گئے۔ مگر افسوس کہ ہماری کوئی تدبیر کامیاب نہ ہوئی۔ ہماری ساری کوششیں ناکام ہو گئیں۔ حسرتؔ موہانی کا کہنا ہے:

؎ دردِ دل کی اُنھیں خبر نہ ہوئی کوئی تدبیر کارگر نہ ہوئی
؎ کوششیں ہم نے کیں ہزار مگر عشق میں ایک معتبر نہ ہوئی

مومن خان مومنؔ کا موقف یہ ہے کہ ہم نے محبوب کو حاصل کرنے کے لیے ہر طرح کی کوشش کی لیکن محبوب ہمیں حاصل نہ ہو سکا۔ ہم نے محبوب کو محبت و خلوص اور سچائی سے حاصل کرنے کی کوشش کی لیکن وہ نہ ملا۔ جب ہماری ساری کوششیں رائیگاں گئیں تو ہم نے خدا کی طرف رجوع کیا اور دُعاؤں اور آہوں کے ذریعے محبوب کو حاصل کرنے کی کوشش کی۔ لیکن محبوب ہمیں کسی بھی طریقے سے حاصل نہ ہو سکا اور ہماری عمر بھر کی تلاش بے کار ہو گئی۔ داغؔ دہلوی کا کہنا ہے:

؎ نہ ملا ہم کو تو وہ ہرجائی
گئی بے کار عمر بھر کی تلاش

میر تقی میرؔ کا کہنا ہے:

؎ وصل کے دن کی آرزو ہی رہی
شب نہ آخر ہوئی جدائی کی

اس دنیائے ممکنات میں اگر کوئی چیز ناممکن ہے تو وہ یہ کہ ہمارا محبوب ہمیں نہ مل سکا۔ زندگی میں مختلف امکانات کے حوالے سے محبوب کے نہ ملنے کا ذکر مومن خان مومنؔ اس طرح کرتے ہیں کہ بظاہر تو دنیا میں کوئی شے ناممکن نظر نہیں آتی کہ ڈھونڈنے والے تو اللہ کو تلاش کر لیتے ہیں لیکن افسوس ہر طرح کوشش کے باوجود ہمارا محبوب ہمیں نہیں مل سکا۔ مومن خان مومن تشریح طلب شعر کے پہلے مصرعے میں ایک دلیل دیتے ہیں کہ یہ دنیا ممکنات کی دنیا ہے۔ یہاں انسان کے لیے اس کا مقصد، اس کا نصب العین حاصل کرنا ممکن ہے۔ ڈھونڈنے والے کو خدا بھی مل جاتا ہے لیکن اگر کوئی بات ناممکن ٹھہری تو وہ یہ کہ ہمارا محبوب ہمیں نہیں ملا۔ میر تقی میرؔ کا کہنا ہے:

؎ ایک محرم چلے میر ہمیں عالم سے
ورنہ عالَم کو زمانے نے دیا کیا کیا کچھ

شعر نمبر 4: (بورڈ 2007,09,10,11,22ء)

تم میرے پاس ہوتے ہو گویا
جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

تشریح: حکیم مومن خان مومنؔ اردو کے مشہور غزل گو شاعر تھے۔ وہ غالبؔ کے ہم عصر اور دوست تھے۔ غمِ عشق اور غمِ زمانہ پر مبنی مومنؔ کے اشعار زندگی کی محبتوں کے عکاس بھی ہیں اور حقیقتوں کے ترجمان بھی۔

www.pakcity.org www.pakcity.org

www.pakcity.org www.pakcity.org www.pakcity.org

زیرِ تشریح شعر میں مومنؔ کہتے ہیں کہ ''جب میرے آس پاس کوئی دوسرا فرد نہیں ہوتا تو تم میرے پاس موجود ہوتے ہو۔''

انسان گروہی زندگی گزارنے پر مجبور ہے۔ اس کی ضروریات کی نوعیت ایسی ہے کہ وہ انھیں تنہا رہ کر پورا نہیں کر سکتا چناں چہ وہ دوسرے لوگوں کے ساتھ رہتا ہے۔ اس سماجی زندگی میں انسان دوسرے انسانوں میں گھرا رہتا ہے۔ ہر وقت اس کے گرد و پیش میں لوگ موجود ہوتے ہیں۔ انسان کے پاس بعض اوقات اپنے لیے بھی وقت نہیں بچتا۔ غالبؔ کا کہنا ہے:

؎ جی ڈھونڈتا ہے پھر وہی فرصت کے رات دن
بیٹھے رہیں تصور جاناں کیے ہوئے

مومن خان مومنؔ کا موقف یہ ہے کہ جب کبھی میرے گرد و پیش میں کوئی دوسرا فرد موجود نہیں ہوتا تو تم موجود ہوتے ہو۔ یہ جسمانی اعتبار سے بھی ممکن ہے کہ محبوب لوگوں کے ہجوم میں چاہنے والے سے ملنا پسند نہیں کرتا اور ذہنی اعتبار سے بھی ممکن ہے کہ انسان جس کے بارے میں زیادہ سوچ، زیادہ غور و فکر کرے بعض اوقات وہ شے مجسم دکھائی دینے لگتی ہے۔ مومنؔ کا یہ کہنا ہے کہ محبوب اگرچہ مجھ سے دور ہے لیکن تصورات کی دنیا میں وہ میرے بہت قریب ہے۔ اکبرؔ الہ آبادی کا کہنا ہے:

؎ جب تمھارا خیال آتا ہے
ساری دنیا کو بھول جاتے ہیں

عشق کی یہ خاصیت ہے کہ وہ محفل میں عاشق کو تنہا کر دیتا ہے اور اسی طرح اس کی ایک خاصیت یہ بھی ہے کہ یہ تنہائی کو محفل بنا دیتا ہے۔ یعنی جس طرح عشق انسان کو میلے مین اکیلا کر دیتا ہے اسی طرح عشق انسان کے اکیلے میں بھی میلا لگا دیتا ہے۔ ایک عاشق جب تنہا ہوتا ہے تو محبوب کے تصورات اُس کو گھیر لیتے ہیں اور وہ دنیا بھر کی ساری چیزوں سے بے خبر ہو کر محبوب کی سوچوں میں گم ہو جاتا ہے اور خیالوں ہی خیالوں میں وہ ایک سہانی دنیا بسا لیتا ہے جہاں محبوب اُس کے پاس ہوتا ہے۔ ناصرؔ کاظمی کا کہنا ہے:

؎ خیالوں ہی میں اکثر بیٹھے بیٹھے
بسا لیتا ہوں اک دنیا سُہانی

مومن خان مومنؔ کے اس شعر کے بارے میں غالبؔ نے کہا تھا کہ اگر مومن خان مومنؔ اپنا یہ شعر مجھے دے دے تو میں اپنا پورا دیوان ان کی نذر کرنے کو تیار ہوں۔ غالب کی یہ داد مومن کے اسلوب کی ستائش ہے کہ سہل ممتنع کی صورت میں ایک اہم نفسیاتی حقیقت کو پیش کیا گیا ہے کہ جوں جوں وابستگی بڑھتی ہے انسان کی توجہ دوسری چیزوں کی طرف سے کم ہونے لگتی ہے۔

تشریح طلب شعر کو اگر عشق حقیقی کے تناظر میں دیکھا جائے تو مومن اس حقیقت کا اعتراف کر رہے ہیں کہ اے اللہ جب میرے پاس کوئی بھی نہیں ہوتا اور میں تنہا ہوتا ہوں تو آپ میرے پاس ہی ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ انسان کی شہ رگ سے زیادہ قریب ہیں۔ انسان جب تنہائی میں ہوتا ہے تو اللہ اُس کے پاس ہوتے ہیں۔ ارشادِ ربانی ہے:

''اور ہم اُس (انسان) سے شہ رگ سے بھی زیادہ قریب ہیں۔''

شعر نمبر 5:

؎ حال دل یار کو لکھوں کیوں کر
ہاتھ دل سے جدا نہیں ہوتا

www.pakcity.org www.pakcity.org

www.pakcity.org www.pakcity.org www.pakcity.org

تشریح: حکیم مومن خان مومنؔ اردو کے مشہور غزل گو شاعر تھے۔ وہ غالبؔ کے ہم عصر اور دوست تھے۔ غمِ عشق اور غمِ زمانہ پر مبنی مومنؔ کے اشعار زندگی کی محبتوں کے عکاس بھی ہیں اور حقیقتوں کے ترجمان بھی۔

زیرِ تشریح شعر میں مومنؔ کہتے ہیں کہ ''میں محبوب کو دل کا حال کیسے لکھوں کہ میں نے تو اپنا ہاتھ درد کی وجہ سے دل پر رکھا ہوا ہے۔''

انسان جو کچھ محسوس کرتا ہے محبوب کے بارے میں جو کچھ سوچتا ہے اور محبوب کی وجہ سے اس پر جو کچھ گزرتی ہے، اس کا اظہار کرنا چاہتا ہے۔ لیکن عام طور پر یہ ہوتا ہے کہ عاشق کو محبوب سے دل کی بات کرنے کا موقع نہیں ملتا۔ جب عاشق کی محبوب کے ساتھ کوئی ملاقات یا گفتگو نہ ہوتی ہو تو وہ اپنے دل کی بات محبوب تک نہیں پہنچا سکتا۔ حالاں کہ اس کی خواہش ہوتی ہے کہ کسی بھی طریقے سے محبوب تک دل کا حال پہنچا دے۔ مومن خان مومنؔ نے اسی طرح کی کیفیت کچھ یوں بیان کی ہے:

؎ جی کی جی ہی میں رہی، بات نہ ہونے پائی
ایک بھی اُس سے ملاقات نہ ہونے پائی

عاشق کی جب محبوب سے براہِ راست کوئی بات چیت نہ ہو تو دل کی بات محبوب تک پہنچانے کا ایک حل یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنا حالِ دل خط کی زبانی لکھ کر محبوب کو بھیج دے۔ مومن خان مومنؔ اس شعر میں اس امکان کو بھی رد کرتے ہوئے یہ کہہ رہے ہیں کہ میں تو محبوب کو اپنے دل کی بات لکھ کر بتانے سے بھی قاصر ہوں۔ اس لیے کہ میرا دل محبوب کی بے وفائی اور جُدائی کی وجہ سے اس قدر بے قرار اور بے تاب ہے کہ میرے لیے اس کو سنبھالنا بہت مشکل ہو گیا ہے۔ مومن خان مومن کا کہنا ہے:

؎ ماجرا ہے سخت مشکل کیا کروں؟
کیا کروں تھمتا نہیں دل کیا کروں؟

مومن خان مومنؔ کا موقف یہ ہے کہ چوں کہ میرے لیے دل سنبھالنا بہت مشکل ہے اس لیے درد کی وجہ سے میں نے اپنا ہاتھ اپنے دل پر رکھا ہوا ہے۔ اردو شاعری میں یہ مضمون کثرت سے ملتا ہے کہ محبت کرنے والوں کی بے قراری اور بے تابی جب حد سے گزر جاتی ہے تو اُن کے لیے محبوب کی جُدائی میں دل سنبھالنا ناممکن ہو جاتا ہے۔ چناں چہ مجبوراً اُنھیں اپنا ہاتھ دل پر رکھنا پڑتا ہے۔ داغؔ دہلوی کا کہنا ہے:

؎ ہاتھ نکلے اپنے دونوں کام کے
دل کو تھاما اُن کا دامن تھام کے

بقول آتشؔ:

؎ دردِ فراق آتشؔ تڑپا رہا ہے ہم کو
اک ہاتھ دل سنبھالے ہے، اک جگر سنبھالے

چوں کہ ہم نے درد کی وجہ سے اپنا ہاتھ دل پر رکھا ہے اس لیے ہمارے لیے یہ ممکن ہی نہیں کہ ہم محبوب کو حالِ دل تحریری شکل میں پہنچا سکیں۔ گویا جس ہستی سے محبت کرتے ہیں، جسے چاہتے ہیں اسی کو اپنے دل کا حال لکھ کر نہیں بھیج سکتے۔ کیوں کہ دل کے درد کی وجہ سے حالِ دل لکھنا ممکن نہیں ہے۔ جی تو چاہتا ہے کہ محبوب کو ہجر و فراق کے دُکھ درد لکھ بھیجیں لیکن تکلیف کی شدت نے بے بس کیا ہوا ہے اور ہم کسی بھی طریقے سے محبوب تک حالِ دل پہنچانے سے قاصر ہیں۔ اکبرؔ الہ آبادی نے اسی صورتحال کا تذکرہ اپنے ایک آسان شعر میں یوں بیان کیا:

؎ چلنا جو میں چاہوں تو قدم اُٹھ نہیں سکتا
لکھنے کی ہو خواہش تو قلم اُٹھ نہیں سکتا

www.pakcity.org www.pakcity.org

www.pakcity.org www.pakcity.org www.pakcity.org

ابراہیم ذوق کا کہنا ہے:

؎ لکھیے اُسے خط میں کہ ستم اُٹھ نہیں سکتا؟
پر ضعف سے ہاتھوں میں قلم اُٹھ نہیں سکتا

شعر نمبر 6:

؎ چارۂ دل، سوائے صبر نہیں
سو، تمھارے سوا نہیں ہوتا

تشریح: حکیم مومن خان مومنؔ اردو کے مشہور غزل گو شاعر تھے۔ وہ غالبؔ کے ہم عصر اور دوست تھے۔ غمِ عشق اور غمِ زمانہ پر مبنی مومن کے اشعار زندگی کی محبتوں کے عکاس بھی ہیں اور حقیقتوں کے ترجمان بھی۔

زیرِ تشریح شعر میں مومنؔ کہتے ہیں کہ ''دل کے دکھ کا علاج صبر ہے لیکن محبوب کے بغیر تو صبر بھی نہیں آتا۔''

محبت کرنے والا ہر طریقے سے محبوب کو حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے لیکن اُس کی ساری کوششیں رائیگاں اور بے کار جاتی ہیں۔ وہ کسی بھی طریقے سے محبوب کو حاصل کرنے میں کامیاب نہیں ہو پاتا۔ جب مقدر میں محبوب کی جدائی لکھی ہو تو عاشق کے دل کے پاس محبوب سے جدا رہ کر زندگی گزارنے کا ایک ہی حل اور طریقہ باقی رہتا ہے کہ وہ صبر سے کام لے اور اپنے سارے دُکھوں اور تکلیفوں کو بھُلاتے ہوئے صبر کا دامن تھام لے۔ مومن خان مومن اپنے ایک اور شعر میں اپنے بے قرار دل کو مخاطب کرتے ہوئے اُسے صبر کی تلقین کی ہے۔ مومنؔ کا کہنا ہے:

؎ صبر کر صبر، ہو چکا جو کچھ
اے دلِ بے قرار! ہونا تھا

یہ ایک حقیقت ہے کہ انسان جب اپنی تمام تر توجہ، سارے خواب، ساری خواہشیں کسی ایک ہستی سے وابستہ کرے تو پھر اس کی جدائی انسان کی دنیا اندھیر کر دیتی ہے اور انسان احساسِ محرومی کا شکار ہو جاتا ہے۔ انسان جس چیز یا شخص کی محرومی کو جتنی شدت سے محسوس کرتا ہے اسے اتنا ہی دکھ ہوتا ہے اور اتنے ہی صبر کی ضرورت بھی ہوتی ہے۔ انسان صبر کرنے کی کوشش تو کرتا ہے مگر عشق کا معاملہ ایک ایسا معاملہ ہے کہ تمام تر کوششوں کے باوجود انسان کو صبر میسر نہیں ہوتا۔ مومن خان مومنؔ نے یہی صورتحال اپنے اشعار میں کچھ یوں بیان کی ہے:

؎ بن ملے آخر رہا جاتا نہیں
صبر کرتا ہوں مگر آتا نہیں

عاشق محبوب کی جدائی میں صبر کرنے کی کوشش تو کرتا ہے لیکن عشق کی آگ وہ آگ ہے جو کبھی بُجھانے سے بجھتی نہیں ہے۔ محبوب کی جُدائی میں عاشق کو ایک لمحہ کا سکون اور صبر حاصل نہیں ہو سکتا۔ عاشق محبوب کے بغیر زندگی کا ایک لمحہ بھی تصور نہیں کر سکتا۔ محبوب اُس کے لیے ناگزیر اور ضروری ہوتا ہے۔ اگر محبوب نہ ملے تو عاشق کے لیے صبر کرنا محال ہو جاتا ہے اور محبوب کے بغیر عاشق کو ایک آن، ایک لمحہ سکون حاصل نہیں ہو پاتا۔ مومن خان مومن کا کہنا ہے:

؎ ترے فراق میں آرام ایک آن نہیں
یہ ہم سمجھ چکے گر تو نہیں تو جان نہیں

مومن خان مومنؔ کا کہنا ہے:

؎ کیا کروں دل پہ اختیار نہیں
جان کو تیرے بن قرار نہیں

www.pakcity.org www.pakcity.org

www.pakcity.org www.pakcity.org www.pakcity.org

مومن خان مومنؔ کا موقف یہ ہے کہ محبوب کے بغیر اب درحقیقت زندگی گزارنا ممکن نہیں ہے۔ دراصل وہ محبوب سے اپنی گہری وابستگی کا اظہار کرتے ہوئے یہ بتا رہے ہیں کہ میرے لیے محبوب کے بغیر صبر کرنا ممکن نہیں ہے۔ یعنی میں دُہری تکلیف میں مبتلا ہوں۔ ایک طرف تو محبوب کو میری حالت پر رحم نہیں آتا۔ اس لیے محبوب کی آرزو بے کار ہے اور دوسری طرف میرے لیے محبوب کے بغیر صبر کرنا ممکن نہیں ہے۔ انہی دو دشواریوں کا تذکرہ مومنؔ کے پیروکار حسرتؔ موہانی نے کچھ ان الفاظ میں کیا ہے:

؎ صبر مشکل، ہے آرزو بے کار
کیا کریں عاشقی میں کیا نہ کریں

شعر نمبر 7:

کیوں سنے عرضِ مضطرب مومنؔ
صنم آخر خُدا نہیں ہوتا

مفہوم: اللہ تعالیٰ کی ذات ہی وہ ذات ہے جو ہر بے قرار کی فریاد سنتی ہے۔ محبوب ایسا نہیں کرتا۔

☆☆☆☆☆

www.pakcity.org
EDUCATION
pakcity.org

www.pakcity.org www.pakcity.org

www.pakcity.org www.pakcity.org www.pakcity.org

مومن خان مومنؔ (غزل نمبر 2)

شعر نمبر 1:

ٹھانی تھی دل میں اب نہ ملیں گے کسی سے ہم
پر کیا کریں کہ ہو گئے ناچار جی سے ہم

تشریح: حکیم مومن خان مومنؔ اردو کے مشہور غزل گو شاعر تھے۔ وہ غالبؔ کے ہم عصر اور دوست تھے۔ غمِ عشق اور غمِ زمانہ پر مبنی مومنؔ کے اشعار زندگی کی محبتوں کے عکاس بھی ہیں اور حقیقتوں کے ترجمان بھی۔

زیرِ تشریح شعر میں مومنؔ کہتے ہیں کہ ''ہم نے پکا ارادہ کیا تھا کہ ہم اُس سے نہیں ملیں گے لیکن کیا کریں کہ ہم دل کے ہاتھوں مجبور ہو گئے ہیں۔''

مولانا محمد حسین آزادؔ اپنی تصنیف ''آبِ حیات'' میں مومن کی اس غزل کا پس منظر بتاتے ہیں کہ ''جہاد'' کے مسئلہ پر مومن اور مولانا فضل حق خیر آبادی میں اختلاف ہو گیا جس پر دونوں دوست ناراض ہو گئے۔ بعد میں دوسرے احباب کی مداخلت سے جب صلح ہو گئی تو مومنؔ نے یہ غزل کہہ کر مولانا کی خدمت میں پیش کی۔

بسا اوقات محبت یا دوستی کے رشتے میں محبت کرنے والوں کو بہت سی تکلیفیں اور دُکھ اُٹھانے کے باوجود محبوب یا دوست سے بے وفائی اور جُدائی کا سامنا کرنا پڑتا ہے تو بالآخر وہ عشق و محبت اور دوستی ختم کرنے کا ارادہ کر لیتے ہیں۔ مومن خان مومنؔ کا موقف بھی یہی ہے کہ ہم نے مجبور ہو کر یہ فیصلہ کر لیا ہے کہ آئندہ ہم محبوب یا دوست سے نہیں ملیں گے۔ اگر محبوب یا دوست کو وفاداری کا پاس نہیں ہے تو ہم بھی دوستی اور محبت کا لحاظ نہیں کریں گے اور ہم بھی آئندہ اُس سے ملاقات یا تعلق نہیں رکھیں گے۔ مومن خان مومنؔ کا کہنا ہے:

؎ جب پاسِ وفا اُسے ہمارا نہ رہا
ہم کو بھی خیال دوستی کا نہ رہا

انسان محبوب یا قریبی دوست سے ترکِ تعلق کا ارادہ تو کر لیتا ہے لیکن اس کے لیے محبوب یا دوست سے رشتہ توڑنا آسان نہیں ہوتا۔ مومنؔ کا یہ کہنا ہے کہ ہم نے یہ طے کر لیا تھا کہ اب اس سے نہیں ملیں گے لیکن ہم اپنے اس فیصلے پر قائم نہیں رہ سکے بلکہ ہم اپنے دل کے ہاتھوں مجبور ہو گئے۔ تعلقات کی نوعیت بعض اوقات بڑی عجیب و غریب ہوتی ہے۔ خاص طور پر ایسے تعلقات جن کی بنیاد محبت پر استوار ہو، جو خلوص اور وفاداری کی بنیاد پر قائم ہوں وہ عارضی طور پر کسی غلط فہمی کی بنیاد پر ٹوٹ بھی جائیں تو فریقین ایک دوسرے کی کمی بہر حال محسوس کرتے ہیں۔ ایسے میں انسان ترکِ دوستی کا ارادہ تو کرتا ہے لیکن وہ اپنے دوست یا محبوب کو بھول نہیں پاتا بلکہ وہ اسے پہلے سے بڑھ کر یاد آنے لگتا ہے۔ حسرتؔ موہانی کا کہنا ہے:

؎ جہاں تک اُنھیں ہم بُھلاتے رہے ہیں
وہ کچھ اور بھی یاد آتے رہے ہیں

مومن خان مومنؔ کا موقف یہ ہے کہ ہم نے فیصلہ کر لیا تھا کہ اب اس سے نہیں ملنا لیکن ہم دل کے ہاتھوں مجبور ہو گئے ہیں۔ ہمارا دل محبوب یا دوست سے تعلق توڑنے پر راضی نہیں ہے کیوں کہ دل کی دنیا کا اپنا الگ ہی دستور ہوتا ہے۔ دل کے فیصلے عقل کے تابع نہیں ہوتے۔ لہٰذا ہم لاکھ کوششوں کے باوجود بھی محبوب یا دوست کو بھُلا نہیں پائے۔ ناسخؔ کا کہنا ہے:

؎ وہ نہیں بھولتا جہاں جاؤں
ہائے میں کیا کروں؟ کہاں جاؤں؟

www.pakcity.org www.pakcity.org

www.pakcity.org www.pakcity.org www.pakcity.org

عدمؔ کا کہنا ہے:

؎ روز کہتا ہوں بھول جاؤں تجھے
روز یہ بات بھول جاتا ہوں

شعر نمبر 2:

ہنستے جو دیکھتے ہیں، کسی کو کسی سے ہم
منہ دیکھ دیکھ روتے ہیں، کس بے کسی سے ہم

تشریح: حکیم مومن خان مومنؔ اردو کے مشہور غزل گو شاعر تھے۔ وہ غالبؔ کے ہم عصر اور دوست تھے۔ غمِ عشق اور غمِ زمانہ پر مبنی مومنؔ کے اشعار زندگی کی محبتوں کے عکاس بھی ہیں اور حقیقتوں کے ترجمان بھی۔

زیرِ تشریح شعر میں مومنؔ کہتے ہیں کہ ''ہم جب کسی کو کسی سے ہنستا دیکھتے ہیں تو ہم اُن کا منہ دیکھ دیکھ کر بہت بے کسی سے روتے ہیں۔''

دوسروں کو خوش دیکھ کر انسان کو اپنی محرومیاں یاد آجاتی ہیں۔ انسان جب دوسروں کو کسی نعمت سے مستفید ہوتے دیکھتا ہے تو اسے اپنی مجبوری کا شدت سے احساس ہوتا ہے۔ مومن خان مومنؔ بھی اسی نفسیاتی کیفیت کا اظہار کرتے ہیں کہ جب لوگ ایک دوسرے سے ہنس ہنس کر ملتے ہیں تو ہمیں بچھڑے ہوئے دوست یاد آتے ہیں اور ہمارا غم مزید گہرا ہو جاتا ہے۔ انسان جس شخص سے جتنی محبت کرتا ہو اس کے بارے میں اتنا ہی حساس ہو جاتا ہے اور اس سے دوری اتنے ہی دکھ کا باعث بنتی ہے۔ عدمؔ کا کہنا ہے:

؎ گلے آپس میں جب ملتے ہیں دو بچھڑے ہوئے ساتھی
عدمؔ ہم بے سہاروں کو بڑی تکلیف ہوتی ہے

انسانی فطرت ہے کہ معاشرتی زندگی گزارتے ہوئے انسان ہر وقت دوسروں سے اپنا تقابل کرتا رہتا ہے۔ اور جہاں کہیں وہ خود کو دوسروں سے کم تر پاتا ہے، اس کی تلافی کرنا چاہتا ہے۔ مومنؔ کا یہ کہنا ہے کہ جب ہم لوگوں کو آپس میں ہنستا بولتا دیکھتے ہیں تو احساسِ محرومی کا شکار ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح ہمیں اپنے گہرے تعلقات کی کمی کا احساس بھی ہوتا ہے۔ جس کی وجہ سے ہمیں رونا آتا ہے۔ بقولِ غالبؔ:

؎ غیر لیں محفل میں بوسے جام کے
ہم رہیں یوں تشنہ لب پیغام کے

''کسی کا کسی سے ہنسنا'' سے مراد اگر محبوب کا رقیب سے ہنسنا لیا جائے تو اس صورت میں مومن خان مومنؔ کا یہ کہنا ہے کہ جب ہمارا محبوب یا دوست رقیب سے ہنسی خوشی ہنستا بولتا ہے تو یہ منظر ہمارے لیے بہت تکلیف دہ اور اذیت ناک ہوتا ہے اور ہم بے کسی اور بے بسی کے عا میں اُن کا منہ دیکھ دیکھ کر اپنی تنہائی اور اکیلے پن پہ روتے رہتے ہیں۔ مومن خان مومنؔ کا کہنا ہے:

؎ بس نہیں چلتا میرا ناچار ہوں
دیکھتا حسرت سے سو سو بار ہوں

مومن خان مومنؔ کا کہنا ہے:

؎ کوئی نہ رہا کہ پونچھے آنسو
کیا روؤں میں اپنی بے کسی کو

یہ ایک حقیقت ہے کہ انسان جب اپنے محبوب یا گہرے دوست کو اوروں میں ہنستا مسکراتا دیکھتا ہے تو انسان کو اپنی بے بسی پر رونا آتا

www.pakcity.org www.pakcity.org

www.pakcity.org www.pakcity.org www.pakcity.org

ہے۔یعنی محبوب کا اوروں میں ہنسنا انسان کو رلانے کا سبب بن جاتا ہے۔خاص طور پر جب انسان کی محبوب سے ناراضی چل رہی ہو تو اس موقع پر محبوب کا کسی دوسرے سے ہنسنا مسکرانا انسان کو اتنا بے بس و بے کس کر دیتا ہے کہ انسان بالآخر رونے پر مجبور ہو جاتا ہے۔بقول میر تقی میرؔ:

ہم سے تو تم کو ضد سی پڑی ہے، خوا مخواہ رُلاتے ہو
آنکھ اُٹھا کر جب دیکھے ہیں، اوروں میں ہنستے جاتے ہو

شعر نمبر 3:

ہم سے نہ بولو تم، اسے کیا کہتے ہیں بھلا
انصاف کیجیے پوچھتے ہیں، آپ ہی سے ہم

تشریح: حکیم مومن خان مومنؔ اردو کے مشہور غزل گو شاعر تھے۔وہ غالبؔ کے ہم عصر اور دوست تھے۔غمِ عشق اور غمِ زمانہ پر مبنی مومنؔ کے اشعار زندگی کی محبتوں کے عکاس بھی ہیں اور حقیقتوں کے ترجمان بھی۔

زیرِ تشریح شعر میں مومنؔ کہتے ہیں کہ ''ہم سے نہ بولو تم'' اسے کیا کہتے ہیں؟ ہمارے ساتھ کی جانے والی ناانصافی پر ہم آپ ہی کو منصف بناتے ہیں۔''

تشریح طلب شعر کے دو پہلو ہیں۔اگر ''ہم سے نہ بولو تم'' سے مراد محبوب یا دوست کا بات چیت یا گفتگو ختم کرنا لیا جائے تو اس صورت میں مومن خان مومنؔ کا یہ کہنا ہے کہ آپ نے جو ہم سے بات چیت کا سلسلہ ختم کر دیا ہے اور تعلق توڑ دیا ہے تو آپ ہی بتائیے کہ کیا یہ ممکن ہے کہ میں آپ سے کلام نہ کروں۔انسانی تعلقات کے حوالے سے یہ بات پیشِ نظر رہنی چاہیے کہ انسان تعلقات کی پائیداری کا خواہش مند ہوتا ہے۔لیکن عام طور پر ایسا نہیں ہوتا۔اس لیے انسان بعض اوقات اپنے مسائل کا حل اُن مسائل کے پیدا کرنے والے سے پوچھنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ حسرتؔ موہانی کا کہنا ہے:

تمھیں انصاف کرو تم سے جدا رہ کے بھلا
عمر آرام سے کس طرح گزارے عاشق

تشریح طلب شعر کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ ''ہم سے نہ بولو تم'' محبوب یا دوست کا جملہ ہے۔محبت کرنے والا جب محبوب سے بات چیت یا گفتگو کرنا چاہتا ہے تو محبوب اپنی فطری بے نیازی اور بے رُخی دکھاتے ہوئے یہ جواب دیتا ہے کہ تم ہم سے بات نہ کیا کرو۔محبت کرنے والوں اور دوستوں کے لیے محبوب یا گہرے دوست کا یہ جملہ بہت تکلیف دہ ہوتا ہے۔حسرتؔ موہانی نے اپنے ایک شعر میں یہی صورت حال بڑے خوب صورت انداز میں بیان کی ہے۔حسرتؔ کا کہنا ہے:

شرما کے بولے بھی تو کیا، ''ہم سے نہ بولو''
کیا خوب تری چھیڑ کا حسرت یہ صلہ ہے

جب محبوب یا گہرا دوست انسان کو گفتگو اور بات چیت سے منع کر دے تو انسان لاجواب ہو جاتا ہے۔اُسے کچھ نہیں سمجھ آتا کہ وہ محبوب یا دوست کے اس جملے پر کیا تبصرہ کرے۔چناں چہ مومن خان مومنؔ یہ کہتے ہیں کہ جو آپ نے ہمیں کچھ بولنے سے منع کر دیا ہے تو ہم آپ کے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے خاموش اور لاجواب ہو گئے۔چوں کہ ہم آپ کے اس جملے کے آگے لاجواب ہو گئے ہیں اس لیے ہم آپ سے ہی پوچھتے ہیں کہ آپ ہی انصاف سے یہ بتا دیں کہ آپ کا یہ کہنا ہمارے لیے کتنا تکلیف دہ ثابت ہوا ہوگا۔داغؔ دہلوی کا کہنا ہے:

www.pakcity.org www.pakcity.org

www.pakcity.org www.pakcity.org www.pakcity.org

جب میں کروں سوال تو کہتے ہو ''چپ رہو''
کیا بات ہے، جواب نہیں اس جواب کا

مرزا غالبؔ کا کہنا ہے:

ہر ایک بات پہ کہتے ہو تم کہ ''تُو کیا ہے؟''
تمہی کہو کہ یہ اندازِ گفتگو کیا ہے؟

شعر نمبر 4:

بیزار جان سے جو نہ ہوتے تو مانگتے
شاہد شکایتوں پہ تیری مدعی سے ہم

تشریح: حکیم مومن خان مومنؔ اردو کے مشہور غزل گو شاعر تھے۔ وہ غالبؔ کے ہم عصر اور دوست تھے۔ غمِ عشق اور غمِ زمانہ پر مبنی مومنؔ کے اشعار زندگی کی محبتوں کے عکاس بھی ہیں اور حقیقتوں کے ترجمان بھی۔

زیرِ تشریح شعر میں مومنؔ کہتے ہیں کہ ''اگر ہم زندگی سے اکتا نہ چکے ہوتے تو ہم تیری شکایتوں پہ مدعی سے گواہ طلب کرتے۔''

عشق و محبت میں یہ اکثر ہوتا ہے کہ رقیب عاشق کے خلاف محبوب کے کان بھرتا ہے۔ رقیب کی یہ کوشش ہوتی ہے کہ وہ عاشق کو محبوب کی نظروں سے گرا دے۔ اسی لیے وہ عاشق کی بہت سی بُرائیاں اور خامیاں محبوب کے سامنے بیان کرتا ہے۔ دراصل رقیب محبوب کے سامنے عاشق کے غلط ہونے کا دعویٰ کرتا ہے۔ داغؔ دہلوی نے اپنے ایک شعر میں رقیب (دشمن) کی اس حرکت کی نشاندہی کی ہے کہ وہ محبوب کو عاشق کے خلاف پٹیاں پڑھاتا رہتا ہے۔ داغؔ کا کہنا ہے:

سکھانے، پڑھانے کو ہیں دوست دُشمن
یہاں کیسے کیسے، وہاں کیسے کیسے

رقیب جب محبوب سے عاشق کی بُرائیاں بیان کرتا ہے تو محبوب رقیب کی باتوں پر یقین کرتے ہوئے اپنے خیال میں عاشق کو غلط سمجھنے لگتا ہے اور عاشق سے ملتے ہی وہ عاشق پر برس پڑتا ہے اور محبوب عاشق سے وہ سارے گلے شکوے اور شکایتیں کرتا ہے جو اُسے رقیب نے پڑھائی ہوتی ہیں۔ یہ صورت حال عاشق کے لیے بہت تکلیف دہ ہوتی ہے کہ جب محبوب رقیب کی باتوں پر یقین کرتے ہوئے اُسے بُرا بھلا کہنا شروع کر دیتا ہے۔ لیکن رقیب اس صورتحال کو دیکھ کر بہت خوش ہوتا ہے۔ داغؔ دہلوی کا کہنا ہے:

وہ دُشنام لاکھوں مجھے دے رہے ہیں
مزے لینے والے مزے لے رہے ہیں

مومن خان مومنؔ کا کہنا یہ ہے کہ میں محبوب کے رویے سے اس قدر بددل ہو چکا ہوں کہ اب جینے کی کوئی خواہش ہی نہیں رہی۔ محبوب جب غیروں کے سمجھانے پر روز روز اُلجھتا، آئے دن جھگڑتا، بات بات پر گلے شکوے کرتا ہے تو ہم اپنی زندگی سے بیزاری محسوس کرتے ہیں۔ یعنی محبوب کا روٹھنا اور اُس کی خفگی ہمارے لیے جان سے بیزاری کی وجہ ہے۔ ذوقؔ کا کہنا ہے:

وہ جو روٹھیں یوں منانا چاہیے
زندگی سے روٹھ جانا چاہیے

www.pakcity.org www.pakcity.org

www.pakcity.org www.pakcity.org www.pakcity.org

داغؔ دہلوی کا کہنا ہے:

؎ رنجش مری بڑھ کر ہے تمہاری خفگی سے
میں جان سے بیزار ہوں، تم مجھ سے خفا ہو

مومنؔ کا کہنا ہے کہ میرے دوست یا محبوب کو مجھ سے کچھ شکایات ہیں، ان کی وضاحت بھی ممکن ہے۔ میرے پاس اپنی بے گناہی کے ثبوت موجود ہیں۔ اس ضمن میں مدعی کو جواب بھی دیا جا سکتا ہے۔ لیکن ایسا تو وہ کرے جو زندہ رہنا چاہتا ہو۔ اگر میں زندگی سے تنگ نہ ہوتا تو مدعی سے ان باتوں کا گواہ طلب کرتا جو اُس نے میرے خلاف بیان کی تھی۔ چوں کہ ہم محبوب کے رویے سے اس قدر بددل ہو چکے ہیں کہ اب جینے کی کوئی خواہش نہیں ہے اس لیے ہمیں کسی گواہ کا کوئی مطالبہ نہیں ہے۔ حسرتؔ موہانی کا کہنا ہے:

؎ ہم کو اُن سے نہ دل کا دعویٰ
نہ گواہی، نہ شاہدی سے غرض

شعر نمبر 5:

بے روئے مثلِ ابر نہ نکلا غبارِ دل
کہتے تھے ان کو برقِ تبسم ہنسی سے ہم

تشریح: حکیم مومن خان مومنؔ اردو کے مشہور غزل گو شاعر تھے۔ وہ غالبؔ کے ہم عصر اور دوست تھے۔ غمِ عشق اور غمِ زمانہ پر مبنی مومنؔ کے اشعار زندگی کی محبتوں کے عکاس بھی ہیں اور حقیقتوں کے ترجمان بھی۔

زیرِ تشریح شعر میں مومنؔ کہتے ہیں کہ ''ہمارے دل کا غبار بادل کی طرح روئے بغیر نہیں نکلا۔ حالاں کہ ہم اُن کے ہنسنے کو مذاق میں بجلی کے چمکنے سے مطابقت دیتے تھے۔''

انسان کے دل کو کوئی صدمہ پہنچے، کوئی بے رخی دکھائے، کوئی زخم پہنچائے تو دل غم سے بھر جاتا ہے اور پھر ضروری ہو جاتا ہے کہ کسی طرح دل کا یہ غبار ہلکا کیا جائے ورنہ شدتِ غم سے دل کے پھٹنے کا اندیشہ بھی ہوتا ہے۔ اس لیے اہلِ غم رو کر اپنے دل کا غبار ہلکا کر لیا کرتے ہیں۔ یہ فطری تقاضا ہمیشہ سے انسان کے ساتھ رہا ہے اور انسان ہمیشہ ہی سے رو کر، فریاد کر کے اور نالہ و شیون کے ذریعے اپنے دکھ درد کا اظہار کرتا ہے۔ رونے سے انسان کے دل کا بوجھ ہلکا ہو جاتا ہے۔ انسان رو رو کر اپنے دل کی آگ بُجھاتا ہے۔ مومنؔ کا کہنا ہے کہ ہمیں بھی اپنے دل کا غبار نکالنے کے لیے بادل کی طرح رونا پڑا۔ مومن خان مومنؔ کا کہنا ہے:

؎ اب گریے میں ڈوب جائیں گے ہم
یوں آتشِ دل بُجھائیں گے ہم

لیکن یہاں ایک اور عجب اتفاق ہوا ہے کہ ایک دوست دوسرے دوست یا ایک عاشق محبوب کے ہنسنے پر اسے داد دیا کرتا تھا۔ دوست یا محبوب جب مسکراتا تھا تو وہ اس کی تعریف کیا کرتا تھا۔ اس کی مسکراہٹ کی مختلف مثالیں بیان کیا کرتا تھا۔ وہ محبوب یا دوست کی مسکراہٹ کو ہنسی مذاق میں بجلی سا قرار دیتا تھا کہ تم جو مسکراتے ہو تو بجلیاں گراتے ہو۔ عدمؔ کا کہنا ہے:

؎ اُس کے ہنسنے کی کیفیت توبہ!
جیسے بجلی چمک چمک جائے

اکبرؔ الہ آبادی کا کہنا ہے:

www.pakcity.org www.pakcity.org

www.pakcity.org www.pakcity.org www.pakcity.org

مِری بے تابیِ دل پر ادا سے مسکراتے ہیں
قیامت کرتے ہیں، بجلی پہ بجلی گراتے ہیں

لیکن اسے نہیں معلوم تھا کہ یہ بات یوں سچ ثابت ہوگی کہ دوست کبھی اس پر سچ مچ مسکرائے گا، ہنسے گا اور محبوب کا یوں ہنسنا اس کا دل دکھائے گا اور وہ دل کا بوجھ ہلکا کرنے کے لیے رو دے گا۔ اس طرح رونے سے دل کا غبار ہلکا ہوتا ہے اور جب دل کا غبار ہلکا ہو جائے تو انسان سوچنے سمجھنے کے قابل بھی ہو جاتا ہے اور پھر اسے غور کرنے کے بعد ایک عجیب احساس ہوتا ہے کہ وہ تو دوست کی مسکراہٹ کو مذاق سے برقِ تبسم کہا کرتا تھا جو سچ مچ بجلی بن گئی اور اس کے دل پر گری اور اسے رونا پڑا۔ یعنی جیسے بجلی چمکنے کے بعد بادل برستا ہے اسی طرح دوست یا محبوب کے ہنسنے کے بعد ہمیں رونا پڑا۔ آتش کا کہنا ہے:

روتا ہے اِدھر ابر، اُدھر ہنس رہی ہے برق
گریے سے کوئی خوش ہے، کوئی خندہ زنی سے

مختصر یہ کہ مومن کا موقف یہ ہے کہ ہم ہنسی میں محبوب کے مسکرانے کو بجلی کے چمکنے سے مطابقت دیتے تھے لیکن اب اگر بادلوں کی طرح رو نہ لیں تب تک دل کا بوجھ ہلکا نہیں ہوتا۔ برق اور بادل کا فطری تعلق یہاں بھی کام کر گیا۔ جیسے برق چمکنے کے بعد ابر برستا ہے اسی طرح دوست یا محبوب کی مسکراہٹ کے بعد ہمیں رونا پڑا۔ یعنی ہمارے رونے کی مثال بادل کی طرح ہے اور تمھارے ہنسنے کی مثال بجلی کی طرح ہے۔ آتش کا کہنا ہے:

ہم چشمِ تر کو سامنے کرتے ہیں ابر کے
تم ہنس پڑو تو برق کا قصہ تمام ہے

شعر نمبر 6:

کیا گل کھلے گا، دیکھیے، ہے فصلِ گل تو دور
اور سوئے دشت بھاگتے ہیں، کچھ ابھی سے ہم

تشریح: حکیم مومن خان مومن اردو کے مشہور غزل گو شاعر تھے۔ وہ غالب کے ہم عصر اور دوست تھے۔ غمِ عشق اور غمِ زمانہ پر مبنی مومن کے اشعار زندگی کی محبتوں کے عکاس بھی ہیں اور حقیقتوں کے ترجمان بھی۔

زیرِ تشریح شعر میں مومن کہتے ہیں کہ ''دیکھتے ہیں کیا گل کھلتا ہے جب کہ بہار دور ہے اور ابھی سے اہلِ جنوں صحرا کی طرف بھاگتے ہیں۔''

اردو شاعری میں بہار اور جنوں کا ذکر لازم و ملزوم ہے۔ بہار کے موسم میں محبت کرنے والوں پر جنوں کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ یہ موسم ہر چیز پر اثر انداز ہوتا ہے۔ جب بہار آتی ہے تو پھول کھلتے ہیں، پرندے چہچہاتے ہیں، ہر طرف سبزہ اور ہریالی نظر آتی ہے، ماحول خوش گوار ہوتا ہے تو محبوب کی کمی کا احساس شدت اختیار کر جاتا ہے اور انسان اس ماحول میں گھٹن محسوس کرنے لگتا ہے اور اس پر جنون کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ میر تقی میر کا کہنا ہے:

کچھ کرو فکر مجھ دوانے کی
دھوم ہے پھر بہار آنے کی

اردو شاعری کی روایت میں محبت کرنے والوں کا ذکر جب بہار کے موسم سے ہوتا ہے تو ایک طرف تو وہ ہمیں چاک گریباں نظر آتے ہیں اور دوسری طرف وہ ہمیں صحرا کی طرف بھاگتے دکھائی دیتے ہیں۔ قیس (مجنوں) نے بھی اسی جنوں کے ہاتھوں صحرا کا رُخ کیا۔ درحقیقت

www.pakcity.org www.pakcity.org

www.pakcity.org www.pakcity.org www.pakcity.org

جب موسمِ بہار میں ہر طرف حسن ہی حسن بکھرا ہوتا ہے تو انسان کو محبوب کی یاد شدت سے آتی ہے۔ یہ سب کچھ دیکھ کر انسان اپنی محرومی کو برداشت نہیں کر پاتا اور وہ اپنے آپ سے بیگانہ ہو جاتا ہے۔ یہی جنون انسان کو دشت و بیاباں میں لے جاتا ہے۔ میرؔ کا کہنا ہے:

؎ گھر میں جی لگتا نہیں اُس بن، تو ہم ہو کر اُداس
دور جاتے ہیں نکل، ہجراں سے گھبرائے ہوئے

جوشؔ ملیح آبادی کا کہنا ہے:

؎ جا کے گوشے میں کسی صحرا کے رو لیتا ہوں میں
یاد آتی ہے جو اپنے گھر کی ویرانی مجھے

مومن خان مومنؔ کا موقف یہ ہے کہ بہار کے آنے کے اثرات نہیں دکھائی دے رہے اور بہار سے پہلے ہی ہم پر جنوں طاری ہونے لگا ہے۔ یہ جنون ہمیں صحرا اور بیاباں کی طرف کھینچ رہا ہے۔ چوں کہ بہار کا موسم بہت دور ہے اور بہار سے قبل ہی ہم پر جنوں طاری ہونے لگا ہے اس لیے ہم بہار کا انتظار نہیں کر سکتے اور ہم جنوں، دیوانگی، وحشت کی کیفیت میں ابھی سے صحراؤں کا رُخ کر لیتے ہیں۔ جگرؔ مرادآبادی کا کہنا ہے:

؎ سوئے صحرا نکل پڑے وحشی
انتظارِ بہار کون کرے؟

مومن خان مومنؔ کا موقف یہ ہے کہ بہار سے قبل ہی ہم جنوں اور وحشت کا شکار ہو کر صحراؤں کی طرف بھاگ رہے ہیں۔ جب بہار سے پہلے جنوں کی یہ کیفیت ہے تو جب بہار کا موسم آ جائے گا تو اس وقت نہ جانے کیا حالت ہوگی۔ ہمارا یہ حال ہے کہ ہمیں جوشِ جنوں صحرا کو لیے جاتا ہے۔

؎ قیس جنگل میں اکیلا ہے، مجھے جانے دو
خوب گزرے گی جو مل بیٹھیں گے دیوانے دو (میاں داد خاں سیاحؔ)

شعر نمبر 7:

لے نام، آرزو کا تو دل کو نکال لیں
مومن نہ ہوں، جو ربط رکھیں بدعتی سے ہم

مفہوم:

آرزوئیں دل میں پیدا ہوتی ہیں اور آرزو کا پیدا ہونا ایک نئی بات ہے۔ اب اگر دل نے یہ نئی راہ نکالی تو ہم اسے سینے سے نکال کر پھینک دیں گے۔

☆☆☆☆☆

www.pakcity.org www.pakcity.org

www.pakcity.org www.pakcity.org www.pakcity.org

حسرت موہانی (غزل نمبر 1)

مشکل الفاظ وتراکیب کی تفہیم

الفاظ	مفہوم
صہبا	شراب
ہم نشیں	دوست
ساغر	پیالہ، جام
ترکِ الفت	محبت کو ختم کرنا
حقیقت کُھل گئی	اصلیت سامنے آ گئی
حب وطن	وطن سے محبت
یاس وہراس	ناامیدی اور ڈر
رسم جفا	ظلم کی رسم
حزم	احتیاط، دوراندیشی
حجاب	شرم، جھجک
ضبط	برداشت
تابہ کجا	کب تک
جَور	ظلم، ستم، سختی
بغض	کینہ، حسد، دشمنی

شعر نمبر 1:

بھلاتا لاکھ ہوں لیکن برابر یاد آتے ہیں
الٰہی ترکِ الفت پر، وہ کیوں کر یاد آتے ہیں

تشریح: سید فضل الحسن المعروف حسرت موہانی اردو کے مشہور غزل گو شاعر اور تحریک آزادی کے راہ نما تھے۔ غمِ دوراں غمِ جاناں اور عصری حالات پر مبنی حسرت کے اشعار معاملاتِ محبت کے ترجمان بھی ہیں اور زندگی کی تلخیوں کے عکاس بھی۔

زیرِ تشریح شعر میں حسرت کہتے ہیں کہ ''میں محبوب کو لاکھ بھلاتا ہوں مگر وہ بہت یاد آتا ہے۔ اے اللہ! ترکِ محبت کے باوجود وہ مجھے کیوں یاد آتا ہے؟''

www.pakcity.org www.pakcity.org

www.pakcity.org www.pakcity.org www.pakcity.org

اگر محبت کے رشتے میں محبت کرنے والے کو بہت سی تکلیفیں اور دُکھ اُٹھانے کے باوجود محبوب سے بے وفائی اور جُدائی کا سامنا کرنا پڑے تو بالآخر وہ عشق و محبت اور دوستی ختم کرنے کا ارادہ کر لیتا ہے۔ حسرتؔ کا موقف بھی یہی ہے کہ ہم نے مجبور ہو کر محبوب کو بھولنے اور محبت ترک کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ چوں کہ محبوب کو وفاداری کا پاس نہیں ہے اس لیے ہم بھی محبت کا لحاظ نہیں رکھیں گے اور ہم بھی آئندہ اُس سے ملاقات یا تعلق نہیں رکھیں گے۔ مومن خان مومنؔ کا کہنا ہے:

؎ جب پاسِ وفا اُسے ہمارا نہ رہا
ہم کو بھی خیال دوستی کا نہ رہا

انسان محبوب سے ترکِ تعلق کا ارادہ تو کر لیتا ہے لیکن اس کے لیے محبوب سے رشتہ توڑنا آسان نہیں ہوتا۔ حسرتؔ کا موقف یہ ہے کہ ہم نے محبت کے دُکھوں، محبوب کے رویے اور اس کی بے وفائی و بے حسی دیکھنے کے بعد ترکِ محبت کا فیصلہ کر لیا لیکن ہم اپنے اس فیصلے پر قائم نہیں رہ سکے بلکہ ہم اپنے دل کے ہاتھوں مجبور ہو گئے۔ تعلقات کی نوعیت بعض اوقات بڑی عجیب و غریب ہوتی ہے۔ خاص طور پر ایسے تعلقات جن کی بنیاد محبت پر استوار ہو، جو خلوص اور وفاداری کی بنیاد پر قائم ہوں وہ وقتی طور پر ٹوٹ بھی جائیں تو بھی ایک شخص دوسرے کی کمی بہر حال محسوس کرتا ہے۔ ایسے میں انسان ترکِ محبت کا ارادہ تو کرتا ہے لیکن وہ اپنے محبوب کو بھول نہیں پاتا بلکہ وہ اسے پہلے سے بڑھ کر یاد آنے لگتا ہے۔ حسرتؔ موہانی کا کہنا ہے:

؎ جہاں تک اُنھیں ہم بھلاتے رہے ہیں
وہ کچھ اور بھی یاد آتے رہے ہیں

حسرتؔ موہانی اللہ تعالیٰ سے مخاطب ہوتے ہوئے اپنی اس ذہنی کشمکش اور بے چینی کا اظہار کر رہے ہیں کہ اے خدا ہم تو محبوب کو بھلانے کی بہت کوشش کرتے ہیں لیکن ہم اُسے لاکھ کوششوں کے باوجود بھلا نہیں پاتے۔ بلکہ صورت حال یہ ہے کہ ہم محبوب کو جتنا بھلانے کی کوشش کرتے ہیں وہ اُتنا ہی شدت سے یاد آتا ہے۔ الطاف حسین حالیؔ رحمۃ اللہ علیہ کا کہنا ہے:

؎ ہوتی نہیں قبول دُعا ترکِ عشق کی
دل چاہتا نہ ہو تو زباں میں اثر کہاں

ہم محبوب کو بھلانا چاہتے ہیں، اُس سے محبت کا رشتہ ختم کرنا چاہتے ہیں لیکن ہم دل کے ہاتھوں مجبور ہو گئے ہیں۔ ہمارا دل محبوب سے تعلق توڑنے پر راضی نہیں ہے کیوں کہ دل کی دنیا کا اپنا الگ ہی دستور ہوتا ہے۔ دل کے فیصلے عقل کے تابع نہیں ہوتے۔ لہٰذا ہم لاکھ کوششوں کے باوجود بھی محبوب کو بھلا نہیں پائے۔ ناسخؔ کا کہنا ہے:

؎ وہ نہیں بھولتا جہاں جاؤں
ہائے میں کیا کروں؟ کہاں جاؤں؟

تسلیمؔ کا کہنا ہے:

؎ روز کہتا ہوں بھول جاؤں تجھے
روز یہ بات بھول جاتا ہوں

www.pakcity.org www.pakcity.org

www.pakcity.org www.pakcity.org www.pakcity.org

شعر نمبر 2:

نہ چھیڑ اے ہم نشیں! کیفیتِ صہبا کے افسانے
شراب بے خودی کے مجھ کو ساغر یاد آتے ہیں

تشریح: سید فضل الحسن المعروف حسرت موہانی اردو کے مشہور غزل گو شاعر اور تحریک آزادی کے راہ نما تھے۔ غمِ دوراں غمِ جاناں اور عصری حالات پر مبنی حسرت کے اشعار معاملاتِ محبت کے ترجمان بھی ہیں اور زندگی کی تلخیوں کے عکاس بھی۔

زیرِ تشریح شعر میں حسرت کہتے ہیں کہ ''اے ہم نشیں! ہمارے سامنے شراب کے سرور کی کیفیت بیان نہ کرو کہ ہمیں بے خود کرنے والی شراب کے پیمانے یاد آتے ہیں۔''

ہوش و حواس انسان کو زندگی کے غموں، دکھوں اور مسائل کا احساس دلاتے ہیں۔ اسی لیے بعض اوقات انسان ہوش و حواس کی قید سے آزاد ہو کر مستی و مدہوشی اور بے خودی کی کیفیت حاصل کرنا چاہتا ہے اور اس کے لیے کبھی تو وہ شراب کے ساغروں کا سہارا لیتا ہے اور کبھی محبوب کی مست نگاہوں کا۔

میر کا کہنا ہے ؎ میر ان نیم باز آنکھوں میں
ساری مستی شراب کی سی ہے

اگرچہ شراب پینا ایک قبیح عمل ہے لیکن ایک شرابی چوں کہ اس کا عادی ہوتا ہے اس لیے شراب کی لذت اور اس سے حاصل ہونے والی بے خودی اس کے لیے بہت اہمیت رکھتی ہے۔ حسرت موہانی کے سامنے اُن کا کوئی دوست شراب سے حاصل ہونے والی مستی و مدہوشی کی کیفیت کا تذکرہ کرتا ہے تو وہ اُسے کہتے ہیں کہ ہمارے سامنے شراب سے ہونے والی مستی و مدہوشی کے تذکرے مت کر کیوں کہ اس سے ہمیں بے خودی اور مدہوشی کی وہ کیفیت یاد آتی ہے جو محبوب کی نگاہیں ہم پر طاری کر دیتی تھیں۔ غالب نے اپنے ایک شعر میں شراب کا مقصد محض بے خودی حاصل کرنا قرار دیا ہے۔ اُن کا کہنا ہے:

مے سے غرضِ نشاط ہے کس روسیاہ کو
اک گونہ بے خودی مجھے دن رات چاہیے

حسرت موہانی کا موقف یہ ہے کہ ہمارے سامنے شراب کی کیفیت کی داستانیں مت چھیڑو کہ ہمیں ایک اور نشہ جو اپنے آپ سے بیگانہ کرنے والا ہے، یاد آتا ہے۔ دراصل عاشق عشقِ محبوب سے اور شرابی شراب سے بے خودی حاصل کرتا ہے۔ حسرت موہانی ایک ایسے عاشق کی تصویر کشی کر رہے ہیں جس کے سامنے اس کے کسی دوست نے شراب 'صہبا' سے حاصل ہونے والی لذت و سرور کا ذکر چھیڑ دیا ہے اور اسے محبوب سے اپنی ملاقاتیں، محبوب کی شربتی رنگ کی آنکھیں اور ہم نگاہی کے لمحات سے حاصل ہونے والی بے خودی اور سرور یاد آجاتا ہے۔ حسرت موہانی کا کہنا ہے:

یاد آتے ہیں سارے وہ عیشِ با فراغت کے مزے
دل ابھی بھولا نہیں آغازِ اُلفت کے مزے

جس طرح شرابی کو شراب پینے کے بعد بے خودی اور مدہوشی کی وہ کیفیت حاصل ہوتی ہے جو اسے غموں اور دکھوں سے آزاد کر دیتی ہے اسی طرح ایک عاشق بھی محبوب کی نگاہوں میں ڈوب کر بے خودی کے عالم میں چلا جاتا ہے جہاں اُسے دنیا کے سارے غم اور تکلیفیں بھول جاتی ہیں۔ ایک عاشق کے لیے محبوب کی جھیل جیسی آنکھیں شراب کے پیمانوں بلکہ کئی مے خانوں سے بڑھ کر ہوتی ہیں۔ وہ محبوب کی مست، نشیلی اور نیم باز

www.pakcity.org www.pakcity.org

www.pakcity.org www.pakcity.org www.pakcity.org

آنکھوں سے وہ بے خودی حاصل کر لیتا ہے جس کے آگے ''کیفیتِ صہبا'' اور ''شرابِ بے خودی کے جام'' کی لذت اور سرور کم تر اور کم کیف محسوس ہوتا ہے۔ مولانا ظفر علی خان کا کہنا ہے:

؎ دیکھا کیے وہ مست نگاہوں سے بار بار
جب تک شراب آئی کئی دور ہو گئے

شعر نمبر 3:

نہیں آتی تو یاد اُن کی، مہینوں تک نہیں آتی
مگر جب یاد آتے ہیں تو اکثر یاد آتے ہیں

تشریح: سید فضل الحسن المعروف حسرت موہانی اردو کے مشہور غزل گو شاعر اور تحریک آزادی کے راہ نما تھے۔ غمِ دوراں غمِ جاناں اور عصری حالات پر مبنی حسرت کے اشعار معاملاتِ محبت کے ترجمان بھی ہیں اور زندگی کی تلخیوں کے عکاس بھی۔

زیرِ تشریح شعر میں حسرت کہتے ہیں کہ ''کبھی تو اُن کی یاد مہینوں تک نہیں آتی اور کبھی وہ اکثر یاد آتے رہتے ہیں۔''

اُردو شاعری میں دو طرح کے عشاق کا تذکرہ ملتا ہے۔ ایک عاشق تو وہ ہوتا ہے جو عشق و محبت میں جنوں اور دیوانگی کی کیفیت کا شکار ہو کر صحراؤں کا رُخ کرتا ہے اور اپنا گریباں چاک چاک کرتا ہے۔ جبکہ اس کے برعکس ایک عاشق وہ ہوتا ہے جو عشق و محبت میں جنوں کی کیفیت کو نہیں پہنچتا بلکہ اس کے ہوش و حواس برقرار رہتے ہیں۔ وہ غمِ دوراں میں الجھ کر غمِ جاناں بھول جاتا ہے۔ وہ زندگی کی مشکلات اور مصیبتوں میں اس قدر اُلجھ جاتا ہے کہ کبھی کبھی محبوب کی یاد اُس کے ذہن سے مٹ جاتی ہے۔ بعض اوقات ایسے ہوتا ہے کہ طویل عرصہ گزر جاتا ہے اور محبوب کی یاد نہیں آتی۔ یہ مضمون فیضؔ کی شاعری میں کثرت سے ملتا ہے۔ اُن کا کہنا ہے:

؎ دنیا نے تیری یاد سے بیگانہ کر دیا
تجھ سے بھی دلفریب ہیں غم روزگار کے

فیضؔ کا کہنا ہے:

؎ اور بھی دُکھ ہیں زمانے میں محبت کے سوا
راحتیں اور بھی ہیں، وصل کی راحت کے سوا

یہ حقیقت ہے کہ جس شے کی اہمیت ہو یا جس شے سے انسان کو محبت ہو تو انسان اُسے یاد رکھتا ہے لیکن زمینی حقائق اتنے سنگین ہوتے ہیں کہ انسان خواہش رکھنے کے باوجود دنیا کے کام، دھندوں میں اس قدر مصروف و مشغول ہو جاتا ہے کہ بہت سی یادیں اُس کے ذہن سے محو ہو جاتی ہیں۔ چناں چہ حسرت پہلے مصرعے میں اسی صورتحال کی وضاحت کر رہے ہیں کہ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ ہم روزگار کے غم میں اس قدر دیوانے ہو جاتے ہیں کہ ہمیں محبوب کی یاد مہینوں تک نہیں آتی۔ ساحرؔ لدھیانوی کا کہنا ہے:

؎ میں اور تم سے ترکِ محبت کی آرزو
دیوانہ کر دیا ہے غمِ روزگار نے

حسرت موہانی کا موقف یہ ہے کہ زمانے گزر جاتے ہیں کہ اس کی یاد ذہن میں نہیں ابھرتی۔ گویا زندگی کی مشکلات اور مصیبتیں بہت بڑھ گئی ہیں اور ان پریشانیوں میں جب کبھی محبوب کی یاد ذہن میں تازہ ہوتی ہے تو پھر اس کی یاد کو بھولنا ناممکن ہو جاتا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ محبت ایسا

www.pakcity.org www.pakcity.org

www.pakcity.org www.pakcity.org www.pakcity.org

جذبہ ہے جس سے دستبرداری ممکن نہیں۔ بعض اوقات انسان کی اپنی کیفیات ماضی کے لمحات یاد دلاتی ہیں اور بعض اوقات گردوپیش میں ہونے والی تبدیلیاں محبوب کی یاد کو تازہ کر دیتی ہیں۔ لیکن جب محبوب یاد آنے لگتا ہے تو انسان دنیا کی ساری سوچیں بھول کر محبوب کی ذات میں کھو جاتا ہے اور جب ایک دفعہ اس کی یاد آ جائے تو جانے کا نام نہیں لیتی اور بھلائے نہیں بھولتی۔ جگر مرادآبادی کا کہنا ہے:

؎ آئی جو اُن کی یاد تو آتی چلی گئی
ہر نقشِ ماسوا کو مٹاتی چلی گئی

اکبر الہ آبادی کا کہنا ہے:

؎ جب تمھارا خیال آتا ہے
ساری دنیا کو بھول جاتے ہیں

شعر نمبر 4:

حقیقت کھل گئی حسرت ترے ترکِ محبت کی
تجھے تو اب وہ پہلے سے بھی بڑھ کر یاد آتے ہیں

مفہوم:

حسرت! آپ ترکِ محبت کا جو دعویٰ کرتے ہیں وہ درست نہیں ہے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ محبوب آپ کو پہلے کی نسبت زیادہ یاد آتا ہے۔

☆☆☆☆☆

www.pakcity.org
EDUCATION
pakcity.org

www.pakcity.org www.pakcity.org

www.pakcity.org www.pakcity.org www.pakcity.org

حسرت موہانی (غزل نمبر 2)

شعر نمبر 1: (بورڈ 2008-2009)

رسم جفا کامیاب، دیکھیے کب تک رہے
حبِ وطن مستِ خواب، دیکھیے کب تک رہے

تشریح: سید فضل الحسن المعروف حسرت موہانی اردو کے مشہور غزل گو شاعر اور تحریک آزادی کے راہ نما تھے۔ غمِ دوراں غمِ جاناں اور عصری حالات پر مبنی حسرت کے اشعار معاملاتِ محبت کے ترجمان بھی ہیں اور زندگی کی تلخیوں کے عکاس بھی۔

زیرِ تشریح شعر میں حسرت کہتے ہیں کہ ''انگریز کے ظلم کی رسم نہ جانے کب تک کامیاب رہتی ہے اور لوگوں کے دلوں میں وطن کی محبت نہ جانے کب تک سوئی رہتی ہے۔''

حسرت موہانی کی یہ غزلِ مسلسل ایک خاص پسِ منظر میں لکھی گئی ہے۔ جس دور میں انھوں نے یہ غزل لکھی اس دور میں برصغیر پر انگریزوں نے قبضہ جما رکھا تھا۔ انگریز نے برصغیر والوں سے آزادی کی نعمت چھین کر انھیں غلامی کی بیڑیوں میں جکڑ لیا تھا۔ انگریز نے اپنے اقتدار کے دوران مسلمانوں پر طرح طرح کے ظلم و ستم کیے۔ مسلمانوں کا قتلِ عام کیا گیا۔ اُن سے اُن کی زمینیں چھین لی گئیں۔ اُن کے عہدے واپس لے لیے گئے۔ مسلمان رہنماؤں کو قید کیا گیا۔ بے شمار لوگوں کو سزائے موت دی گئی۔ مسلمان ہونا جرم قرار پایا۔ مسلمانوں کا معاشی و معاشرتی استحصال کیا گیا۔ غرض ہر طریقے سے مسلمانوں پر ظلم و ستم ڈھائے گئے۔ حسرت موہانی کی اسی غزل کے دو اشعار ملاحظہ فرمائیں:

نام سے قانون کے ہوتے ہیں کیا کیا ستم
جبر بہ زیرِ نقاب دیکھیے کب تک رہے

دولتِ ہندوستان، قبضۂ اغیار میں
بے عدد و بے حساب دیکھیے کب تک رہے

حسرت موہانی انگریز کے مظالم کا تذکرہ کرتے ہوئے بتاتے ہیں کہ انگریز بڑے عرصے سے مسلمانوں پر ظلم و ستم کرنے میں کامیاب رہا ہے۔ اُس نے ظلم و ستم کرنا اپنی عادت اور رسم بنا لیا ہے۔ انھیں بڑی بے چینی اور بے قراری سے اُس وقت کا انتظار کر رہے ہیں جب انگریز کے ان مظالم کا سلسلہ ختم ہو جائے گا۔ مومن خان مومنؔ نے یہی کیفیت کچھ یوں بیان کی ہے:

کب تک یہ ستم کے طور ظالم
کب تک یہ جفا و جور ظالم

شعر کے دوسرے مصرعے میں حسرت موہانی برصغیر کے مسلمانوں میں غفلت اور حُبِّ وطن کی کمی پر تنقید کر رہے ہیں۔ وطن سے محبت ہر جاندار کی فطرت میں شامل ہے جس طرح اگر پودے کو اس کی جگہ سے اکھاڑ کر دوسری جگہ لگایا جائے تو وہ مرجھا جاتا ہے۔ پرندے جو موسم تبدیل ہونے پر ہزاروں میل کا سفر طے کر کے دوسری جگہ منتقل ہو جاتے ہیں اور پھر موسم تبدیل ہونے پر اپنی سرزمین پر واپس آ جاتے ہیں۔ یہی حالت انسانوں کی بھی ہے۔ وطن سے یہ فطری محبت اس لیے ہوتی ہے کہ وطن انسان کی پہچان ہوتا ہے۔ انسان کو جس شے سے محبت ہوتی ہے اس کو تباہ و برباد ہوتے ہوئے نہیں دیکھ سکتا ہے۔ محبت کا یہ تقاضا ہے کہ انسان اپنی محبوب ہستی یا شے کی حفاظت کرتا ہے۔ حسرت موہانی کا موقف ہے کہ

www.pakcity.org www.pakcity.org

www.pakcity.org www.pakcity.org www.pakcity.org

برصغیر کے لوگوں پر جو ظلم ہو رہا ہے اور جس طرح وہ ہر سختی کو برداشت کر رہے ہیں اس رویے کو دیکھ کر اس طرح لگتا ہے کہ لوگوں کے دل میں وطن کی محبت سوئی ہوئی ہے اور وہ یورپ کی غلامی پر رضامند ہیں۔ اقبال رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے ایک شعر میں اپنے ہم وطنوں سے یہی شکوہ کچھ یوں کیا ہے:

؎ یورپ کی غلامی پہ رضامند ہوا تُو
مجھ کو تو گلا تجھ سے ہے یورپ سے نہیں ہے

مختصر یہ ہے کہ حسرت نے پہلے مصرعے میں انگریز کے مظالم پر اور دوسرے مصرعے میں مسلمانوں کی غفلت پر تنقید کی ہے۔ انھیں شدت سے اُس وقت کا انتظار ہے کہ جب انگریز کے ظلم کا یہ سلسلہ ختم ہو جائے گا اور مسلمانوں کے دل میں وطن کی محبت جاگ اُٹھے گی۔ فیض نے اپنے ایک شعر میں حکومت اور عوام کی ان ہی دو خامیوں کا ذکر کچھ یوں بیان کیا ہے۔

؎ اِک گردنِ مخلوق، جو ہر حال میں خم ہے
اِک بازوئے قاتل کہ خوں ریز بہت ہے

شعر نمبر 2:

دل پہ رہا مدتوں، غلبۂ یاس و ہراس
قبضۂ حزم و حجاب، دیکھیے کب تک رہے

تشریح: سید فضل الحسن المعروف حسرت موہانی اردو کے مشہور غزل گو شاعر اور تحریک آزادی کے راہ نما تھے۔ غمِ دوراں غمِ جاناں اور عصری حالات پر مبنی حسرت کے اشعار معاملاتِ محبت کے ترجمان بھی ہیں اور زندگی کی تلخیوں کے عکاس بھی۔

زیرِ تشریح شعر میں حسرت کہتے ہیں کہ ''مسلمانوں کے دل پر ایک طویل عرصے تک ''خوف اور مایوسی'' چھائی رہی۔ دیکھتے ہیں یہ ''احتیاط اور جھجھک'' کب تک برقرار رہتی ہے۔''

حسرت موہانی کے اس شعر میں دو مختلف ادوار کی نشاندہی کی گئی ہے۔ شعر کے پہلے مصرعے میں جنگِ آزادی 1857ء کے بعد مسلمانوں کی دلی کیفیت کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ جنگِ آزادی سے قبل مسلمانوں نے انگریز سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لیے بہت سی کوششیں کیں۔ احمد شاہ ابدالی، ٹیپو سلطان رحمۃ اللہ علیہ اور سید احمد شہید رحمۃ اللہ علیہ نے مسلمانوں کو آزادی دلانے کے لیے پے در پے کوششیں کیں لیکن وہ کامیاب نہ ہو سکے۔ جنگِ آزادی میں بھی مسلمانوں کو شکست کا سامنا کرنا پڑا تو مسلمانوں کے دل میں انگریز کا خوف بیٹھ گیا۔ وہ یہ سمجھنے لگے کہ انگریز ناقابلِ شکست ہے۔ یوں وہ آزادی کے حصول سے مایوس ہو کر رہ گئے۔ مسلمانوں کی دلی حالت کچھ یوں تھی جیسا کہ ساحر لُدھیانوی نے اپنے اس شعر میں بیان کی ہے:

؎ دلوں پہ خوف کے پہرے، لبوں پہ قُفلِ سکوت
سروں پہ گرم سلاخوں کے شامیانے ہیں

مسلمان ایک عرصے تک اسی خوف و ہراس کا شکار رہے۔ لیکن جب سر سید احمد خان رحمۃ اللہ علیہ اور دیگر مسلم رہنماؤں نے اپنی کوششوں سے مسلمانوں میں تعلیمی شعور بیدار کیا، اُن کی معاشی اور معاشرتی حالت بہتر بنانے کی کوششیں کیں اسی طرح جب 1906ء میں جب مسلم لیگ کا قیام عمل میں آیا تو مسلمانوں کے دل سے مایوسی اور خوف و ہراس ختم ہو گیا۔ اُنھیں اُمید کی ایک کرن نظر آئی۔ لیکن اُن حالات میں مسلمانوں کے دل میں ''مایوسی اور خوف'' کی جگہ ''احتیاط اور جھجھک'' نے لے لی۔ اب مسلمان خوفزدہ اور مایوس تو نہیں تھے لیکن اپنے حقوق کے مطالبات میں شرم اور جھجھک اختیار کرتے ہوئے محتاط رویے اور مصلحت سے کام لینے لگے تھے۔ فیض احمد فیض کا کہنا ہے:

www.pakcity.org www.pakcity.org

www.pakcity.org www.pakcity.org www.pakcity.org

نثار میں تری گلیوں پہ اے وطن! کہ جہاں
چلی ہے رسم کہ کوئی نہ سر اُٹھا کے چلے

اس شعر کے دوسرے مصرعے میں اُسی دور کا ذکر کرتے ہوئے حسرت کا یہ کہنا ہے کہ مسلمانوں کے دل سے مایوسی اور خوف تو ختم ہو گیا ہے، دیکھتے ہیں اب یہ احتیاط اور جھجک کا رویہ کب تک برقرار رہتا ہے۔ یعنی وہ بہت بے چینی سے اُس وقت کا انتظار کر رہے ہیں جب مسلمانوں کے دل سے یہ احتیاط اور جھجک بھی ختم ہو جائے گی۔ مختصر یہ کہ حسرت مسلمانوں کو یہ نصیحت کرنا چاہتے ہیں کہ انھیں محتاط رویہ نہیں رکھنا چاہیے بلکہ آزادی حاصل کرنے کے لیے انھیں جبر کے خلاف آواز بلند کرنی چاہیے اور نصب العین کے حصول تک جدوجہد جاری رکھنی چاہیے اور اپنے وطن کے لیے فکر مند ہونا چاہیے۔ اقبال رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اپنے ہم وطنوں کو اسی طرح کی نصیحت کچھ یوں کی ہے:

وطن کی فکر کر ناداں مصیبت آنے والی ہے
تری بربادیوں کے مشورے ہیں آسمانوں میں
نہ سمجھو گے تو مٹ جاؤ گے اے ہندوستاں والو!
تمھاری داستاں تک بھی نہ ہو گی داستانوں میں

شعر نمبر 3:

تا بہ کجا ہوں دراز سلسلہ ہائے فریب
ضبط کی لوگوں میں تاب دیکھیے کب تک رہے

تشریح: سید فضل الحسن المعروف حسرت موہانی اردو کے مشہور غزل گو شاعر اور تحریک آزادی کے راہ نما تھے۔ غمِ دوراں غمِ جاناں اور عصری حالات پر مبنی حسرت کے اشعار معاملاتِ محبت کے ترجمان بھی ہیں اور زندگی کی تلخیوں کے عکاس بھی۔

زیرِ تشریح شعر میں حسرت کہتے ہیں کہ ''انگریز کے فریب کے سلسلے کب تک طویل ہوں گے اور لوگ کب تک تحمل کا مظاہرہ کرتے رہیں گے۔''

جب لوگ محرومیوں کا شکار ہوں تو ایک امکان یہ بھی ہوتا ہے کہ لوگ حقوق کے حصول کے لیے اٹھ کھڑے ہوں اور ان افراد یا اداروں کو ختم کرنے کی کوشش کریں جو ان کے حقوق غصب کیے ہوئے ہیں۔ اس صورت حال میں لوگوں کو مختلف رویوں کے دھوکوں میں مبتلا کر دیا جاتا ہے۔ انھیں سبز باغ دکھائے جاتے ہیں۔ روشن مستقبل کی خوش خبری سنائی جاتی ہے اور مجبور اور بے بس افراد اس دھوکے میں آ بھی جاتے ہیں۔ انگریز نے بھی برصغیر والوں سے بہت سے دھوکے دیے۔ انگریز کا سب سے بڑا دھوکا تو یہ تھا کہ وہ برصغیر میں تجارت کے بہانے آیا اور دیکھتے ہی دیکھتے اُس نے برصغیر پر قبضہ جما لیا۔ اسی طرح اُس نے دورانِ اقتدار بھی کئی دھوکے دیے۔ اُس نے کئی دفعہ برصغیر سے جانے کا اعلان کیا لیکن عین وقت پر وہ مکر گیا۔ برصغیر کی مجبور اور بے بس عوام پر انگریز کے ان دھوکوں کا جادو چل گیا۔ وہ انگریز کی اس چالاکی سے دوبارہ غفلت کی نیند سو گئے۔ اقبال رحمۃ اللہ علیہ کا کہنا ہے:

خواب سے بیدار ہوتا ہے ذرا محکوم اگر
پھر سُلا دیتی ہے اُس کو حکمراں کی ساحری

انگریز کے دھوکا دہی کا سلسلہ جاری تھا اور مسلمان انگریز کے تمام مظالم اور دھوکوں کو برداشت کر رہے تھے۔ چناں چہ شعر کے دوسرے مصرعے میں حسرت موہانی مسلمانوں کی اسی سوچ پر تنقید کرتے ہوئے اُنھیں یہ نصیحت کر رہے ہیں کہ مسلمانوں کو انگریز کے مظالم برداشت کرنے

www.pakcity.org www.pakcity.org

www.pakcity.org www.pakcity.org www.pakcity.org

کے بجائے اُن کے خلاف آواز بلند کرنی چاہیے۔حدیث مبارکہ میں آتا ہے:

''ظالم حکمران کے سامنے کلمہ حق بلند کرنا افضل جہاد ہے۔''

مسلمانوں کو یہ چاہیے کہ وہ انگریز کے ان مظالم اور دھوکوں کے خلاف اُٹھ کھڑے ہوں۔ اِن سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لیے مکمل جدوجہد کریں کیوں کہ جو شخص ظالم کے ظلم کو برداشت کرتا ہے اور اُسے اِس سے نہیں روکتا در حقیقت وہ بھی ظالم کے ظلم میں برابر کا شریک ہے۔ ساحرلُدھیانوی کا کہنا ہے:

ظالم کو جو نہ روکے، وہ شامل ہے ظلم میں
قاتل کو جو نہ ٹوکے، وہ قاتل کے ساتھ ہے

مختصر یہ کہ حسرتؔ موہانی بڑی بے چینی اور بے قراری سے اُس وقت کا انتظار کر رہے ہیں جب انگریز کا دھوکا دہی کا یہ سلسلہ ختم ہو جائے گا کیوں کہ ہر چیز کی ایک حد ہوتی ہے اور اس حد سے جب کوئی شے بڑھ جائے تو اس کے خلاف ردِعمل شروع ہو جاتا ہے۔ اسی طرح حسرتؔ موہانی کو مسلمانوں کی ''برداشت کی طاقت'' کے خاتمے کا شدت سے انتظار ہے۔ یعنی پہلے مصرعے میں وہ انگریز کے مظالم اور دوسرے مصرعے میں مسلمانوں کی برداشت کی طاقت کے خاتمے کا انتظار کر رہے ہیں۔ اقبالؒ نے بھی مسلمانوں سے یہی شکوہ کیا ہے:

یورپ کی غلامی پہ رضامند ہوا تُو
مجھ کو تو گلا تجھ سے ہے یورپ سے نہیں ہے

شعر نمبر 4:

پردۂ اصلاح میں، کوششِ تخریب کا
خلقِ خدا پر عذاب، دیکھیے کب تک رہے

تشریح: سید فضل الحسن المعروف حسرتؔ موہانی اردو کے مشہور غزل گو شاعر اور تحریک آزادی کے راہنما تھے۔ غمِ دوراں غمِ جاناں اور عصری حالات پر مبنی حسرتؔ کے اشعار معاملاتِ محبت کے ترجمان بھی ہیں اور زندگی کی تلخیوں کے عکاس بھی۔

زیرِ تشریح شعر میں حسرتؔ کہتے ہیں کہ ''خدا کی مخلوق پر'' اصلاح کے پردے'' میں'' تباہی و بربادی کی کوشش'' کا عذاب دیکھتے ہیں کب تک رہتا ہے۔''

اللہ تبارک وتعالیٰ نے زمین پر فساد پھیلانے والوں کو ناپسند کیا ہے لیکن بعض لوگ فساد کو اصلاح کا نام دے دیتے ہیں اللہ تعالیٰ نے اصلاح کی بنا پر بھی فتنہ اور فساد کو ناپسند کیا ہے۔ ارشادِ ربانی ہے:

''کہ جب ان سے کہا جائے کہ زمین پر فساد نہ پھیلاؤ تو وہ کہتے ہیں ہم تو اصلاح کر رہے ہیں''۔

برصغیر پاک و ہند میں انگریزوں نے اصلاح کے نام پر یہاں کی معاشرتی، سماجی، اخلاقی اور سیاسی قدروں کو تباہ و برباد کرنے کی کوشش کی۔ کیوں کہ مغرب والوں کا یہ اصول رہا ہے۔ ''تقسیم کرو اور حکومت کرو۔'' یعنی انگریز ''امن اور اصلاح'' کا نعرہ لگا کر در حقیقت ہر طرف تباہی اور بربادی پھیلا رہا تھا۔ ساحرلُدھیانوی نے اسی صورتحال کا نقشہ کچھ یوں کھینچا ہے۔

بنامِ امن ہیں جنگ و جدل کے منصوبے
بشورِ عدل تفاوت کے کارخانے ہیں

دراصل کوئی بھی حکومت یہ نہیں چاہتی کہ اس کے خلاف کسی بھی طرح کی مزاحمت ہو اور اگر یہ مزاحمت موجود ہو تو اسے ختم کرنے کی

www.pakcity.org www.pakcity.org

www.pakcity.org www.pakcity.org www.pakcity.org

کوششوں کو اصلاح کا نام، دے دیا جاتا ہے اور لوگوں کو طرح طرح کے عذاب میں مبتلا کر دیا جاتا ہے ان سے آزادی رائے چھین لی جاتی ہے ان کی پہچان ختم کرنے کی کوشش کی جاتی ہے اور انھیں بعض اوقات ناکردہ غلطیوں کی سزا بھی دی جاتی ہے۔ برصغیر میں بیسویں صدی کے آغاز میں انگریز حکومت نے یہ کہا کہ ہر دس سال بعد برصغیر میں اصلاحات نافذ کی جائیں گی تاکہ مقامی لوگوں کے حقوق کی حفاظت ہو سکے لیکن ان اصلاحات کے نام پر درحقیقت مقامی لوگوں کے حقوق غصب کیے جانے لگے۔ جس کی بدترین مثال 1919ء میں رولٹ ایکٹ کا نفاذ تھا۔ جس کے ذریعے لوگوں سے آزادیٔ اظہار چھین لی گئی۔ جس پر احتجاج کرنے کے نتیجے میں جلیانوالہ باغ کا سانحہ ظہور پذیر ہوا۔ حسرت موہانی کا کہنا ہے:

؎ نام سے قانون کے ہوتے ہیں کیا کیا ستم
جبر بہ زیرِ نقاب دیکھیے کب تک رہے
دولتِ ہندوستان، قبضۂ اغیار میں
بے عدد و بے حساب دیکھیے، کب تک رہے

دراصل انگریز نے دورانِ اقتدار برصغیر کے لوگوں کو بے وقوف بنانے کے لیے بظاہر بہت سے اچھے کام کیے۔ اُس نے ریلوے کا محکمہ بنایا، کئی ہسپتال تعمیر کیے، کئی کالجز بنائے۔ لیکن یہ سب چیزیں عوام کو بے وقوف بنانے کے لیے تھیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر کسی کو سونے کے پنجرے میں قید کر کے اُس سے آزادی چھین لیں تو یہ اُس کے ساتھ دھوکا کے مترادف ہے اور انگریز نے بھی یہی کیا۔ مختصر یہ کہ حسرت موہانی کا موقف یہ ہے کہ برصغیر کے لوگوں کو اصلاح کا جھانسا دے کر کب تک بے وقوف بنایا جاتا رہے گا۔

؎ کب تک یہ ستم کے طور ظالم
کب تک یہ جفا و جور ظالم
(مومن خان مومنؔ)

شعر نمبر 5:

حسرتِ آزاد پر، جورِ غلامانِ وقت
از رہِ بغض و عتاب، دیکھیے کب تک رہے

مفہوم:

نہ جانے کب تک ابن الوقت ہم سے دشمنی کرتے رہیں گے اور ہم پر ان کی وجہ سے مصیبتیں نازل ہوتی رہیں گی۔

☆☆☆☆☆

www.pakcity.org www.pakcity.org

www.pakcity.org www.pakcity.org www.pakcity.org

فیض احمد فیضؔ (غزل نمبر 1)

مشکل الفاظ وتراکیب کی تفہیم

الفاظ	مفہوم
ناوکِ نیم کش	ادھ کھینچا تیر
سنگ	پتھر
دل ریزہ ریزہ	ٹکڑے ٹکڑے دل
نوید	خوشخبری
بانکپن	وضع داری، البیلا پن، سرکشی
کج	ٹیڑھا
چارہ گر	معالج
پسِ مرگ	موت کے بعد
کشتنی	مارے جانے کے قابل
گفتنی	بات جو کہنے کے قابل ہو
کوہ گراں	وزنی پہاڑ جو اپنی جگہ سے نہ ہلے
مقتل	قربان گاہ
ہجر	جدائی

شعر نمبر 1:

نہ گنواؤ ناوکِ نیم کش دلِ ریزہ ریزہ گنوا دیا
جو بچے ہیں سنگ، سمیٹ لو، تنِ داغ داغ لٹا دیا

تشریح: فیض احمد فیضؔ مشہور ترقی پسند شاعر تھے۔ غمِ دوراں اور غمِ جاناں پر مبنی فیضؔ کے آفاقی اشعار زندگی کی تلخیوں کے عکاس بھی ہیں اور الجھنوں کے ترجمان بھی۔

زیرِ تشریح شعر میں فیضؔ کہتے ہیں کہ ''ہمارے زخمی دل اور جسم بے جاں ہو چکے ہیں۔ اب ان پر مزید تیر چلانے اور پتھر برسانے کی ضرورت نہیں رہی۔ تم اپنے ادھ کھینچے تیر اور پتھر سنبھال کر رکھ لو۔''

فیضؔ محبوب سے مخاطب ہیں کہ تمھارے تیروں سے ہمارا زخمی دل بے حال ہوتا چلا گیا، دل پر زخم ہوتے چلے گئے، تمھارے تیر دل کو چور

www.pakcity.org www.pakcity.org

www.pakcity.org www.pakcity.org www.pakcity.org

چُور کرتے چلے گئے یہاں تک کہ تمھارے دیے ہوئے زخموں کی تاب نہ لاکر ہمارا دل بے جان ہوگیا۔ اب اُس میں مزید زخم سہنے کی سکت باقی نہیں رہی۔ اے محبوب! ہمارے جس دل کو مٹانا چاہتے تھے، تمھارے تیروں نے آخر کار اُسے مٹا دیا ہے۔ اب اس پر مزید تیر چلانے کی زحمت نہ کرو۔ تم تیر چلانے کی تیاری کر رہے ہو۔ کمان پر تیر رکھ کر چلّے کو کھینچ رہے ہو، اپنے ادھ کھینچے تیر کو ضائع نہ کرو، تمھارا ہدف یعنی ہمارا دل تمھارے تیروں سے چھلنی ہو کر بے جان ہو چکا ہے۔ اب مزید تیروں کی ضرورت باقی نہیں رہی، جو تیر تم چلانے کے لیے تیار ہو، اُنھیں سنبھال کر، بچا کر رکھو، کسی اور دل کو زخمی کرنے کے کام آئیں گے۔

آخر کو آج اپنے لہو پر ہوئی تمام
بازی میانِ قاتل و خنجر لگی ہوئی

(فیضؔ)

اے محبوب! تم جو پتھر برساتے رہے وہ جسم کو زخمی کرتے رہے، اُن پتھروں کی ضربات نے بالآخر میری جان لے لی ہے، تم اپنے مقصد میں کامیاب ہوگئے، اب جو پتھر تمھارے پاس باقی بچ گئے ہیں، اُنھیں بچا کر رکھو، اُنھیں کسی اور طلب گار کے جسم پر برسانا۔

فیضؔ ترقی پسند تحریک کا حصہ اور کمیونزم کے داعی تھے۔ وہ ملک وقوم میں معاشی استحصال اور معاشرتی عدم مساوات کے خلاف آواز اُٹھاتے رہے، قیام پاکستان سے جو حقوق و آزادی کے تحفظ کی اُمیدیں وابستہ تھیں، وہ پوری نہ ہوئیں تو وہ ہم وطن حکمرانوں کے جبر کے خلاف سرگرم ہوگئے۔ اس کی پاداش میں وہ جیل گئے اور اُنھوں نے جلاوطنی اختیار کی۔ اُن کے کچھ ہم خیال ساتھی پابندِ سلاسل ہو کر رہ گئے اور کچھ جاں سے گزر گئے۔ فیضؔ کی اس غزل کے پسِ منظر میں اُن سرفروش رفقا کی قربانیوں کی جھلک نظر آتی ہے۔

اس غزل میں وہ محبوب کے پردے میں جابر حکمرانوں سے مخاطب ہیں۔ غزل کی مجموعی فضا سیاسی ہے۔

سب قتل ہو کے تیرے مقابل سے آئے ہیں
ہم لوگ سُرخرو ہیں کہ منزل سے آئے ہیں

(فیضؔ)

اس سیاسی پس منظر میں شعر کا مفہوم یوں ہے کہ اے جابر حکمرانو! تم ہماری جاں کے درپے تھے۔ تمھارے سارے ستم، تیر، پتھر، قید و بند کی سختیاں، نفسیاتی حربے، سب کے سب ہمیں حرفِ غلط کی طرح مٹانے اور تمھاری راہ سے ہٹانے کے لیے تھے۔ اپنی راہ سے نہیں ہٹے، تمھارے سِتم بڑھتے رہے اور آخر کار ہم نے ارضِ وطن اور اپنے نظریے کے لیے جاں کا نذرانہ پیش کر دیا ہے، وطن پر دل و جاں قربان کر دیے ہیں، اب تمھیں مزید ستم کرنے اور جبر کرنے کی ضرورت باقی نہیں رہی۔

گریباں کفن کا تو رہنے دے ثابت
مری خاک سے کیوں تو دامن کشاں ہے

(میرؔ)

شعر نمبر 2:

مرے چارہ گر کو نوید ہو صفِ دشمناں کو خبر کرو
وہ جو قرض رکھتے تھے جاں پر، وہ حساب آج چکا دیا

www.pakcity.org www.pakcity.org

www.pakcity.org www.pakcity.org www.pakcity.org

تشریح: فیض احمد فیض مشہور ترقی پسند شاعر تھے۔ غمِ دوراں اور غمِ جاناں پر مبنی فیض کے آفاقی اشعار زندگی کی تلخیوں کے عکاس بھی ہیں اور الجھنوں کے ترجمان بھی۔

زیرِ تشریح شعر میں فیض کہتے ہیں کہ ہم نے اپنی زندگی دے کر دوستوں اور دشمنوں سبھی کے لیے خوشی کے اسباب پیدا کر دیے ہیں۔ میرے دکھوں کا مداوا کرنے والوں کو یہ خوش خبری سنا دو اور میرے قاتلوں کو بھی یہ اطلاع دے دو کہ ہم نے جان دے کر دونوں کا قرض اتار دیا ہے۔

انسان کو جب کوئی پریشانی ہو، وہ کسی دکھ میں مبتلا ہو تو اس کی آرزو ہوتی ہے کہ کوئی دوست ہو، کوئی چارہ گر ہو جو میری پریشانیوں کو دور کرنے کی کوشش کرے جو میرے مسائل کا حل، میری الجھنوں کا سلجھاؤ پیش کرے، فیض کے یہاں چارہ گر موجود تو ہیں لیکن وہ چارہ گری کرتے دکھائی نہیں دیتے۔

؎ ہر چارہ گر کو چارہ گری سے گریز تھا
ورنہ ہمیں جو دکھ تھے بہت لادوا نہ تھے

فیض کی نظم ''شیشوں کا مسیحا کوئی نہیں'' ہمیں اس امر کی گواہی ہے کہ بعض معاملات ایسے ہوتے ہیں جہاں چارہ گری کرنا ممکن نہیں ہوتی، ایسی صورت حال میں چارہ گر بھی الجھن میں مبتلا ہو جاتا ہے اور اس کی یہ پریشانی تبھی ختم ہوتی ہے جب دکھ درد میں مبتلا فرد جان سے گزر جائے۔ یوں اس کا مرنا چارہ گر کے لیے خوش آئند خبر بن جاتی ہے۔ دوسری طرف قاتل کی کوشش ہوتی ہے کہ اس کا دشمن صفحۂ ہستی سے مٹ جائے۔ وہ اپنے دشمن کے ختم ہونے کی خبر کا منتظر رہتا ہے گویا دوست اور دشمن دونوں ایک ہی اطلاع کا انتظار کر رہے ہوتے ہیں، ہمارا وجود، ہمارا ہونا زندہ رہنا ان کی دین تھا ہم پر ایک قرض تھا آج ہم نے اپنی جان دے کر یہ قرض اتار دیا ہے۔ حبیب جالب کا کہنا ہے۔

؎ اب رہیں چین سے بے درد زمانے والے
سو گئے خواب سے لوگوں کو جگانے والے

فیض کا موقف یہ ہے ہماری موت اپنوں، پرائیوں، دوستوں اور دشمنوں سبھی کے لیے باعث اطمینان ہوگی وہ جو افتخار عارف نے کہا ہے کہ مصاحبین شہ مطمئن ہوئے۔

کہ سرفراز، سر بریدہ بازوؤں سمیت شہر کی فصیل پہ لٹک رہے ہیں اور ہر طرف سکون ہے۔
سکون ہی سکون ہے۔

شعر نمبر 3:

کرو کج جبیں پہ سرِ کفن مرے قاتلوں کو گماں نہ ہو
کہ غرورِ عشق کا بانکپن پسِ مرگ ہم نے بھلا دیا

تشریح: (بورڈ 2010)

فیض احمد فیض مشہور ترقی پسند شاعر تھے۔ غمِ دوراں اور غمِ جاناں پر مبنی فیض کے آفاقی اشعار زندگی کی تلخیوں کے عکاس بھی ہیں اور الجھنوں کے ترجمان بھی۔

زیرِ تشریح شعر میں فیض کہتے ہیں کہ میری پیشانی پر کفن کو تھوڑا ٹیڑھا کر دو کہ کہیں میرے قاتل یہ نہ سمجھنے لگیں کہ موت کے بعد ہم نے

www.pakcity.org www.pakcity.org

www.pakcity.org www.pakcity.org www.pakcity.org

عشق کا بانکپن یا طنطنہ بھلا دیا ہے۔ کسی انسان کو اس کے موقف سے ہٹانے کے لیے مختلف ہتھکنڈے استعمال کیے جاتے ہیں۔ کہیں روپے پیسے کا لالچ دیا جاتا ہے، کہیں کوئی منصب یا عہدہ رشوت کے طور پر عطا کیا جاتا ہے اور جسے ان دو طریقوں سے نہ خریدا جا سکے اسے ظلم و جبر کے ذریعے دبایا جاتا ہے یا ختم کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ فیضؔ کے یہاں حق کے متوالوں کو کوئی ظلم یا جبر حق گوئی سے نہیں روک سکتا وہ جبر میں بھی اختیار پیدا کر لیتے ہیں۔

شہیدانِ وفا کے حوصلے تھے داد کے قابل
وہاں پر شکر کرتے تھے، جہاں پر صبر مشکل تھا

فیضؔ کو اپنے موقف کی سچائی کا پورا یقین ہے اور اس صداقت کا اثر یہ ہے کہ موت بھی سچے شخص کے انداز کو نہیں بدل سکی وہ اپنے قاتلوں کو بھی یہ باور کرانا چاہتا ہے کہ کفن میں بھی عشق کا بانکپن برقرار ہے۔ گویا موت بھی ہمارے جذبے کو شکست نہیں دے سکتی۔ جب انسان ایک بڑے نصب العین کے لیے جان دیتا ہے تو پھر جان دینا ہی اہم نہیں ہوتا۔ جان دینے کا انداز بھی اہم ہو جاتا ہے۔

جس دھج سے کوئی مقتل میں گیا وہ شان سلامت رہتی ہے
یہ جان تو آنی جانی ہے اس جاں کی تو کوئی بات نہیں

فیضؔ کفنانے والوں کے مخاطب ہے کہ موت کے بعد پیشانی پر کفن کا کنارہ ٹیڑھا کر دو تا کہ اگر قاتلوں میں سے کوئی ہماری میت پر آئے تو اسے ہماری کج کلاہی سے اندازہ ہو کہ ہمیں اپنے موقف پر ندامت یا شرمندگی نہیں بلکہ ہمارے مرنے کے بعد بھی ہمارے بانکپن برقرار ہے اور اس میں کوئی کمی نہیں آئی۔ فیضؔ کا کہنا ہے۔

سرِ خسرو سے نازِ کجکلاہی چھن بھی جاتا ہے
کلاہِ خسروی سے بوئے سلطانی نہیں جاتی

شعر نمبر 4:

ادھر ایک حرف کہ کشتنی، یہاں لاکھ عذر تھا گفتنی
جو کہا تو سن کے اڑا دیا جو لکھا تو پڑھ کے مٹا دیا

(بورڈ 2010)

تشریح:

فیض احمد فیضؔ مشہور ترقی پسند شاعر تھے۔ غمِ دوراں اور غمِ جاناں پر مبنی فیضؔ کے آفاقی اشعار زندگی کی تلخیوں کے عکاس بھی ہیں اور الجھنوں کے ترجمان بھی۔

زیرِ تشریح شعر میں فیضؔ کہتے ہیں کہ وہ ہمارا موقف کسی بھی صورت میں سننے کے لیے تیار نہیں تھے۔ ہمارے پاس اپنی صفائی میں کہنے کے لیے بے شمار باتیں تھیں لیکن انھیں سن کر ان سنا کر دیا گیا اور اگر ہم نے اپنا موقف لکھ کر پیش کیا تو مٹا دیا گیا اور جواباً ایک ہی بات کہی گئی کہ اسے قتل کر دیا جائے۔

ظلم و جبر اپنے آپ کو منوانے کے لیے سب سے پہلے لوگوں سے آزادی رائے چھین لیتا ہے۔ لوگوں کو بولنے کے حق سے محروم کر دیا جاتا ہے۔

بات کرنی مجھے مشکل کبھی ایسی تو نہ تھی
جیسی اب ہے تیری محفل کبھی ایسی تو نہ تھی

www.pakcity.org www.pakcity.org

www.pakcity.org www.pakcity.org www.pakcity.org

جبر بڑھتا ہے تو صرف زبان پر مہر سکوت ثبت کرنے تک بات نہیں رکتی بلکہ لوگوں کو آزادی تحریر سے بھی محروم کر دیا جاتا ہے، کیوں کہ لفظ چاہے زبان سے ادا ہو چاہے قلم سے کاغذ پر منتقل ہو، ایک پیغام، ایک نعرہ، ایک تحریک کی صورت اختیار کر لیتا ہے، چناں چہ ظلم و استبداد تبھی باقی رہ سکتا ہے کہ حق کی آواز بلند نہ ہو اور یہ آواز بلند کرنے والوں کو صفحہ ہستی سے مٹا دیا جائے۔ درد کا کہنا ہے۔

؎ اس نے قصداً بھی میرے نالے کو
نہ سنا ہو گا گر سنا ہو گا

فیض ایسی ہی اک تصویر ہمارے سامنے رکھتے ہیں جس میں پنجہ استبداد بے گناہوں کو دبوچے ہوئے ہے۔ جب دلیل کا جواب دلیل سے نہ دیا جا سکے تو پھر منفی قوتیں ہمیشہ حق کی آواز کو خاموش کرانے کی کوشش کرتی ہیں۔ وہ سقراط ہو، سپارٹیکس ہو، حسین ابن علی رضی اللہ عنہ ہو، پابلو نرودا ہو، محمود رحمۃ اللہ علیہ درویش ہو، ناظم حکمت ہو، سچ بولنے والوں کے مقدر میں ہمیشہ دار و رسن ہی رہے ہیں۔ یہ ہماری بدقسمتی ہے کہ ہم نہ جانے کب سے ظلم و جبر کے سائے میں زندگی بسر کرتے چلے آ رہے ہیں۔

؎ لکھتے رہے جنوں کی حکایاتِ خوں چکاں
ہر چند اس میں ہاتھ ہمارے قلم ہوئے

وہ افراد جنھیں اپنے موقف پر اعتماد ہو وہ موت سے نہیں ڈرتے لیکن یہ احساس تو بہر حال رہتا ہے کہ ہم سے ہماری زبان کیوں چھین لی گئی۔ ہمیں اظہار کی نعمت سے کیوں محروم کر دیا گیا ہے۔ ایسے میں انسان بے ساختہ پکار اٹھتا ہے۔

؎ کوئی تو سود چکائے کوئی تو ذمہ لے
اس انقلاب کا جو آج تک ادھار سا ہے

شعر نمبر 5:

جو رکے تو کوہِ گراں تھے ہم جو چلے تو جاں سے گزر گئے
رہِ یار ہم نے قدم قدم، تجھے یادگار بنا دیا

تشریح: فیض احمد فیض مشہور ترقی پسند شاعر تھے۔ غمِ دوراں اور غمِ جاناں پر مبنی فیض کے آفاقی اشعار زندگی کی تلخیوں کے عکاس بھی ہیں اور الجھنوں کے ترجمان بھی۔

زیرِ تشریح شعر میں فیض کہتے ہیں کہ کوئی بھی مشکل ہمیں اپنے موقف سے پیچھے ہٹنے پر مجبور نہ کر سکی۔ دوست تک پہنچنے کے راستے میں اگر ہم ٹھہر گئے تو ہماری استقامت پہاڑوں سے بڑھ کر تھی کہ جنھیں اپنی جگہ سے ہٹانا ناممکن ہوتا ہے اور اگر ہم چل پڑے تو چاہے جان سے گزرنا پڑا ہم نے پروا نہیں کی پھر موت بھی ہمارا راستہ نہ روک سکی اور یوں ہم نے اس راستے کا چپہ چپہ یادگار بنا دیا ہے۔

زندگی میں ثابت قدمی کی بڑی اہمیت ہے۔ وہ فرد ہی ثابت قدمی کا مظاہرہ کر سکتا ہے جسے اپنے موقف پر یقین ہو۔ جو کمٹ منٹ یا عہد مندی کے تقاضوں کو پورا کرنا جانتا ہو۔ اس کے لیے بلند ہمتی کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔

؎ ہر اک قدم اجل تھا، ہر اک گام زندگی
ہم گھوم پھر کے کوچۂ قاتل سے آئے ہیں

فیض رہِ وفا میں کسی بھی نوعیت کی کمزوری کا مظاہرہ کرنے کے قائل نہیں۔ ان کے پائے استقامت میں کسی بھی طرح کی لغزش نہیں۔ یہی وجہ ہے وہ اس راستے میں ٹھہر جائیں یا چل پڑیں ان کے لیے زندگی یا موت مسئلہ نہیں بلکہ اپنے راستے پر ثابت قدم رہنا اہم ہے۔ یہی وجہ ہے

www.pakcity.org www.pakcity.org

www.pakcity.org www.pakcity.org www.pakcity.org

کہ وہ قدم قدم پر اپنے آپ کو کامیاب سمجھتے ہیں۔

؎ مقام فیضؔ کوئی راہ میں جچا ہی نہیں
جو کوئے یار سے نکلے تو سوئے دار چلے

کسی فرد سے محبت کا معاملہ ہو یا اپنی سرزمین سے، ایک سچے اور پرخلوص انسان کے لیے محبت کے تقاضوں کو پورا کرنا اہم ہوتا ہے۔ فیضؔ کی زندگی اس بات کی گواہ ہے کہ انھوں نے قید و بند کی صعوبتیں برداشت کیں، وطن سے دوری برداشت کی، بیوی بچوں کی جدائی سہی لیکن مصلحت اختیار نہ کی۔ بلکہ وطن سے محبت کا ترانہ ہی آپ کے ہونٹوں پر موجود رہا۔

؎ مری زمیں ہی مرا آخری حوالہ ہے
سو میں رہوں نہ رہوں اس کو بارور کردے

www.pakcity.org
EDUCATION
pakcity.org

www.pakcity.org www.pakcity.org

www.pakcity.org www.pakcity.org www.pakcity.org

فیض احمد فیضؔ (غزل نمبر 2)

شعر نمبر 1:

کب یاد میں تیرا ساتھ نہیں، کب ہات میں تیرا ہات نہیں
صد شکر کہ اپنی راتوں میں اب ہجر کی کوئی رات نہیں

تشریح: فیض احمد فیضؔ مشہور ترقی پسند شاعر تھے۔ غمِ دوراں اور غمِ جاناں پر مبنی فیضؔ کے آفاقی اشعار زندگی کی تلخیوں کے عکاس بھی ہیں اور الجھنوں کے ترجمان بھی۔

زیرِ تشریح شعر میں فیضؔ کہتے ہیں کہ محبوب سے دوری کا زمانہ ختم ہو گیا ہے۔ یہ مقام شکر ہے کہ ہمارے اور ہمارے محبوب کے درمیان جدائی کی ساعتیں ختم ہو گئی ہیں۔ اب ہمارا اور اس کا ساتھ صرف یادوں ہی میں نہیں بلکہ اس کا ہاتھ ہمارے ہاتھوں میں ہے۔

انسانی فطرت ہے کہ انسان جس سے محبت کرتا ہے اسے اپنی نظروں کے سامنے موجود دیکھنا چاہتا ہے اور جوں جوں یہ وابستگی بڑھتی ہے، اسے دیکھتے رہنے کی آرزو بھی بڑھ جاتی ہے اور ایک مرحلہ ایسا بھی آتا ہے کہ انسان کو پلکوں کا جھپکنا بھی دیکھنے کے عمل میں رکاوٹ محسوس ہوتا ہے۔

؎ نظارے کو یہ جنبشِ مژگاں بھی بار ہے
نرگس کی آنکھ سے تجھے دیکھا کرے کوئی

فیضؔ کے لیے وطن بھی اتنا ہی عزیز ہے جتنا کسی بھی انسان کو اپنا محبوب عزیز ہوتا ہے۔ وطن سے دوری ان کے لیے اتنی ہی تکلیف دہ ہے جتنی محبوب سے دوری تکلیف دہ ہوتی ہے۔ بعض سیاسی وجوہ کی بنا پر انھیں وطن سے دور رہنا پڑا۔

مرے دل مرے مسافر
ہوا پھر سے حکم صادر
کہ وطن بدر ہوں ہم تم

وطن سے دوری فیضؔ کو مایوس نہیں ہونے دیتی۔ وہ یہ یقین رکھتے ہیں کہ یہ دوری عارضی ہے۔ بہت جلد اسے ختم ہو جانا ہے کیوں کہ ظلم ہمیشہ مسندِ اقتدار پر قابض نہیں رہ سکتا۔ وہ لوگ جن کا رشتہ اپنی سرزمین سے گہرا اور اٹوٹ ہوتا ہے وہ گردشِ زمانہ کا علاج کرنا جانتے ہیں۔

؎ جو تجھ سے عہدِ وفا استوار رکھتے ہیں
علاج گردشِ لیل و نہار رکھتے ہیں

فیضؔ کے تشریح طلب شعر میں اس خواب کی تعبیر پیش کی جا رہی ہے کہ اب وطن سے دوری کے دن ختم ہو چکے ہیں۔

شعر نمبر 2:

مشکل ہیں اگر حالات وہاں دل بیچ آئیں جاں دے آئیں
دل والو کوچۂ جاناں میں کیا ایسے بھی حالات نہیں

تشریح: فیض احمد فیضؔ مشہور ترقی پسند شاعر تھے۔ غمِ دوراں اور غمِ جاناں پر مبنی فیضؔ کے آفاقی اشعار زندگی کی تلخیوں کے عکاس بھی ہیں اور الجھنوں کے ترجمان بھی۔

www.pakcity.org www.pakcity.org

www.pakcity.org www.pakcity.org www.pakcity.org

زیرِ تشریح شعر میں فیضؔ کہتے ہیں کہ کیا محبوب کی گلی میں حالات اتنے سنگین ہو گئے ہیں کہ دل و جاں کی قربانی بھی پیش نہیں کی جا سکتی۔ محبوب کی گلی میں دل کا نذرانہ پیش کرنا یا جان ہار دینا محبت کی دلیل ہے۔ لیکن محبت کرنے والے کے لیے جب قربانی دینا بھی مشکل بنا دی جائے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ حالات انتہائی سنگین ہو گئے ہیں اب محبت کا اظہار کرنا بھی ممکن نہیں رہا۔ بعض اوقات وطن سے محبت ہی جرم بن جاتی ہے۔

نثار میں تری گلیوں کے اے وطن کہ جہاں
چلی ہے رسم کہ کوئی نہ سر اٹھا کے چلے

ہماری بدقسمتی کہ آزادی کے تھوڑے ہی عرصے کے بعد عنان اقتدار ایسے لوگوں کے ہاتھ میں آ گئی جنھوں نے ملک کو اپنی ذاتی جاگیر سمجھ لیا اور عوام کو غلام سمجھنے لگے۔ لوگوں کو ان کے بنیادی حقوق سے محروم کر دیا گیا۔ معاشرے سے عدل و انصاف ناپید ہو گیا، لاقانونیت بڑھنے لگی، زندگی مشکل سے مشکل تر ہونے لگی اور وہ لوگ جو آزادی کی بات کرتے، لوگوں میں مساوات کی ضرورت پر زور دیتے، بنیادی حقوق کا مطالبہ کرتے انھیں غدار قرار دیا جانے لگا۔ وطن سے ان کی محبت محلِ نظر قرار پائی اور بقول حبیب جالبؔ:

وہ کہہ رہے ہیں محبت نہیں وطن سے مجھے
سکھا رہے ہیں محبت مشین گن سے مجھے

فیضؔ کا موقف یہ ہے کہ حالات جتنے بھی سنگین کیوں نہ ہو جائیں، کسی کو زندگی قربان کرنے سے تو نہیں روکا جا سکتا۔ پاک سرزمین پر دل و جاں قربان کرنے سے ہی شاید حالات بہتر ہو جائیں۔

شعر نمبر 3: (بورڈ 2007)

جس دھج سے کوئی مقتل میں گیا وہ شان سلامت رہتی ہے
یہ جان تو آنی جانی ہے اس جاں کی تو کوئی بات نہیں

تشریح: فیض احمد فیضؔ مشہور ترقی پسند شاعر تھے۔ غمِ دوراں اور غمِ جاناں پر مبنی فیضؔ کے آفاقی اشعار زندگی کی تلخیوں کے عکاس بھی ہیں اور الجھنوں کے ترجمان بھی۔

زیرِ تشریح شعر میں فیضؔ کہتے ہیں کہ زندگی تو عارضی اور ناپائیدار ہے اس کی کوئی بات نہیں اصل چیز یہ ہے کہ انسان موت کا سامنا کس طرح کرتا ہے۔ یہ انداز باقی رہ جانے والا ہے۔ زندگی کی بے ثباتی طے شدہ ہے۔ مذہب ہمیں یہی بتاتا ہے کہ ہر شے فانی ہے اور ہر جاندار نے موت کا ذائقہ چکھنا ہے۔ ہمارا مشاہدہ بھی ہمیں یہی باور کراتا ہے کہ جو لوگ کل تھے وہ آج نہیں ہیں اور جو آج ہیں وہ کل نہیں ہوں گے۔

ہستی ہماری اپنی فنا پر دلیل ہے
یاں تک مٹے کہ آپ ہی اپنی قسم ہوئے

فیضؔ کا موقف ہے کہ اصل چیز یہ ہے کہ کوئی شخص موت کا سامنا کس طرح کرتا ہے۔ وہ اپنی کتاب ''میزان'' میں ایک جگہ لکھتے ہیں۔ کسی قوم کے اجتماعی مزاج کو سمجھنا ہو تو یہ دیکھنا چاہیے کہ اس قوم کے افراد موت کا سامنا کیسے کرتے ہیں۔ موت کا خوف انسان کو بزدل بنا دیتا ہے۔ اپنے موقف کے درست ہونے کا یقین نہ ہو تب بھی انسان جان دینے سے ہچکچاتا ہے۔ لیکن اپنے موقف کی صداقت انسان کو بہادر بنا دیتی ہے۔ وہ موت سے نہیں ڈرتا، بلکہ خود فیضؔ ہی کے الفاظ میں:

مرنے چلے تو سطوتِ قاتل کا خوف کیا
اتنا تو ہو کہ باندھنے پائے نہ دست و پا

موت کی گھڑی انسان کی ساری زندگی، اس کی تمام سرگرمیوں، اس کے اعمال، اس کی گفتگو ہر چیز کا از سرِ نو تعین کرتی ہے۔ اس کے

www.pakcity.org www.pakcity.org

www.pakcity.org www.pakcity.org www.pakcity.org

دعوے اس کی کمٹ منٹ، اس کے نظریات اور ان نظریات کے ساتھ اس کی وابستگی کا بھی اسی لمحے پتہ چلتا ہے۔ چناں چہ کسی فرد کا موت کا سامنا کرنے کا انداز ہی یاد رہنے والی چیز ہے۔

؎ شہیدانِ وفا کے حوصلے تھے داد کے قابل
وہاں پر شکر کرتے تھے، جہاں پر صبر مشکل تھا

شعر نمبر 4:

میدانِ وفا دربار نہیں، یاں نام و نسب کی پوچھ کہاں
عاشق تو کسی کا نام نہیں، کچھ عشق کسی کی ذات نہیں

تشریح: فیض احمد فیضؔ مشہور ترقی پسند شاعر تھے۔ غمِ دوراں اور غمِ جاناں پر مبنی فیضؔ کے آفاقی اشعار زندگی کی تلخیوں کے عکاس بھی ہیں اور الجھنوں کے ترجمان بھی۔

زیرِ تشریح شعر میں فیضؔ کہتے ہیں کہ محبت نہ تو معاشی طبقات کو مانتی ہے اور نہ رنگ و نسل کو اہمیت دیتی ہے۔ محبت مقام و مرتبہ کو نہیں مانتی یہ کسی بادشاہ کا دربار نہیں جہاں لوگوں کے آباؤ اجداد کی نسبت دیکھی جاتی ہے۔ عشق کسی ذات برادری کا نام نہیں اور نہ ہی عشق کرنے والا (عاشق) کسی فرد کا نام ہے۔

عہدِ ملوکیت میں خاندانی شرافت، نجابت کی بڑی اہمیت رہی ہے۔ بادشاہ کے دربار میں ہر کس و ناکس کے لیے جگہ نہیں ہوتی تھی۔ بلکہ وہی لوگ وہاں جگہ پا سکتے تھے جو نسل در نسل بادشاہ کے وفادار رہے ہوں۔ جن کی خدمات اظہر من الشمس ہوں۔ لوگوں کی کوشش ہوتی تھی کہ کسی نہ کسی طرح دربار میں ان کی رسائی ہو جائے کیوں کہ اختیار و اقتدار کا مرکز و محور بادشاہ کا دربار ہوا کرتا تھا۔ اور اقتدار حاصل کرنے کے لیے دربار تک پہنچنا ضروری ہوتا۔ محبت نہ تو اقتدار و اختیار کو مانتی ہے، نہ ذات پات کو نہ رنگ و نسل کو، محبت تو ایسا جذبہ ہے جو برابری اور مساوات کا قائل ہے۔

؎ قیس ہو کوہکن ہو یا حالیؔ
عاشقی کچھ کسی کی ذات نہیں

محبت تو تسلیم و رضا ہے، قربانی کا نام ہے، انسانیت کا اظہار ہے، افراد کو آپس میں مجتمع کرنے والی قوت ہے۔ حضرت علیؓ کا ارشاد ہے:

''قرابت کے لیے محبت کی جتنی ضرورت ہوتی ہے، محبت کے لیے قرابت کی اتنی ضرورت نہیں ہوتی''۔

انسانوں کو جو چیزیں تقسیم کرتی ہیں، ان میں ذات پات کی تقسیم، رنگ و نسل کا فرق، معاشرتی اور معاشی اونچ نیچ شامل ہے۔ فیضؔ کا موقف یہ ہے کہ محبت ان باتوں کو نہیں مانتی محبت انسانیت پر یقین رکھتی ہے۔ محبت کرنے والوں کے لیے حکومت، منصب اقتدار اور اختیار بے معنی چیزیں ہیں۔ ان کے لیے تو خلوص ہی سب سے بڑا اقتدار ہوتا ہے۔

؎ دلوں کو دام میں لانا ہی شہر یاری ہے
خلوص سب سے بڑا اقتدار ہے ساقی

حسرتؔ موہانی کا کہنا ہے۔

؎ کوچہ یار میں ہیں سب یکساں
بادشاہ و گدا، امیر و فقیر

www.pakcity.org www.pakcity.org

www.pakcity.org www.pakcity.org www.pakcity.org

شعر نمبر 5:

گر بازی عشق کی بازی ہے جو چاہو لگا دو ڈر کیسا
گر جیت گئے تو کیا کہنا، ہارے بھی تو بازی مات نہیں

تشریح: فیض احمد فیض مشہور ترقی پسند شاعر تھے۔ غمِ دوراں اور غمِ جاناں پر مبنی فیض کے آفاقی اشعار زندگی کی تلخیوں کے عکاس بھی ہیں اور الجھنوں کے ترجمان بھی۔

زیرِ تشریح شعر میں فیض کہتے ہیں کہ محبت میں ہارنے کا تصور ہی موجود نہیں ہوتا۔ محبت کے کھیل میں جو جی چاہے داؤ لگا دو کیوں کہ اس میں جیت ہی جیت ہے۔ انسانی زندگی مختلف نوعیت کی سرگرمیوں سے عبارت ہے۔ کوئی بھی عمل ہو انسان ہر قدم اٹھانے سے پہلے اس کے مضمرات کے بارے میں سوچتا ہے۔ اس کے مثبت اور منفی پہلوؤں کے بارے میں سوچتا ہے۔ نفع اور نقصان کا اندازہ لگاتا ہے اور وہی کام کرتا ہے، وہی راستہ اختیار کرتا ہے جس میں نفع ہو۔ کوئی انسان بھی گھاٹے کا سودا کرنے کو تیار نہیں ہوتا بلکہ نقصان کا امکان تو انسان سے عمل کی قوت چھین لیتا ہے۔

؎ ارادے باندھتا ہوں، سوچتا ہوں، توڑ دیتا ہوں
کہیں ایسا نہ ہو جائے کہیں ویسا نہ ہو جائے

فیض کا موقف یہ ہے کہ عشق میں نقصان کی کوئی اہمیت نہیں۔ یہ عشق اللہ تعالیٰ کی ذات سے ہو، اپنے جیسے انسانوں سے یا اپنی سرزمین سے، عشق اختیار کرنے والا بہر صورت کامیاب رہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے یہاں ہمیں کہیں بھی موت کا خوف دکھائی نہیں دیتا بلکہ:

؎ سرفروشی کے انداز بدلے گئے دعوتِ قتل پر مقتل شہر میں
ڈال کر کوئی گردن میں طوق آ گیا لا کر کوئی کاندھے پہ دار آ گیا

زندگی میں آگے بڑھنے کے لیے، ترقی کرنے کے لیے انسان کے ارادے کو مضبوط رکھنے کے لیے فیض کے خیال میں عشق ہی معاون ثابت ہو سکتا ہے۔ یہی جذبہ ہے جو ناممکن کو ممکن بنا دیتا ہے۔ علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ اسے کبھی صدقِ خلیل علیہ السلام قرار دیتے ہیں کبھی صبرِ حسین رضی اللہ عنہ کبھی دم جبرائیل علیہ السلام۔ فیض کے اس تشریح طلب شعر میں علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ کے تصورِ عشق کی توسیع نظر آتی ہے۔ علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ اس جذبہ کو اصلِ حیات قرار دیتے ہیں:

؎ مردِ خدا کا عمل عشق سے صاحب فروغ
عشق ہے اصلِ حیات موت ہے اس پر حرام

فیض کے موقف کے مطابق بھی عشق میں کامیابی ہی کامیابی ہے۔ اس لیے کوئی بھی خطرہ مول لینے میں نہیں ہچکچانا چاہیے۔ عشق کی بازی میں انسان جیت کر بھی کامیاب ہوتا ہے اور ہار کر بھی۔

فراق کا کہنا ہے۔

؎ بازیٔ عشق کی پوچھ نہ بات
جیت کی جیت ہے، مات کی مات

www.pakcity.org www.pakcity.org www.pakcity.org

احمد ندیم قاسمی (غزل نمبر 1)

مشکل الفاظ وتراکیب کی تفہیم

الفاظ	مفہوم
آتش وآب	آگ اور پانی
قعرِ دریا	دریا کی گہرائی
روزِ ازل سے	اوّل روز سے، ابتدا ہی سے
اعجاز	معجزہ
مفر	جائے فرار، چارۂ کار
سقراط	مشہور یونانی فلسفی جسے زہر کا پیالہ پلا کر سزائے موت دی گئی۔
سلیقہ	ڈھنگ، قرینہ
قرینہ	سلیقہ
آنکھ کا بینا ہونا	اصلیت تک پہنچنے والی نگاہ
محروم تمنا	خواہشات سے محرومی
یک جا	اکٹھا

شعر نمبر 1: (بورڈ 2007-2010)

کچھ غلط بھی تو نہیں تھا، مرا تنہا ہونا
آتش و آب کا ممکن نہیں، یکجا ہونا

تشریح: احمد شاہ المعروف احمد ندیم قاسمی اردو کے مشہور شاعر اور نثر نگار تھے۔ نکتہ آفرینی اور آفاقیت ان کی شاعری کا خاصہ ہے۔ غمِ عشق غمِ زمانہ اور آفاقی موضوعات پر مبنی ندیم کے اشعار زندگی کی حقیقتوں کے ترجمان بھی ہیں اور الجھنوں کے عکاس بھی۔

زیرِ تشریح شعر میں ندیم کہتے ہیں کہ ''اگر میں تنہا ہوں تو اس میں کوئی حیرانی کی بات نہیں ہے کیوں کہ آگ اور پانی اکٹھے نہیں رہ سکتے۔'' انسان کی ضروریات کی نوعیت ہی ایسی ہے کہ وہ تنہا رہ کر زندگی نہیں گزار سکتا۔ لیکن سماجی زندگی گزارتے ہوئے ضروری نہیں کہ انسان کا اچھے لوگوں سے پالا پڑے کیوں کہ یہ سماجی تعلقات انسانی مرضی کے تابع نہیں۔ جب انسان اپنے گرد و پیش میں خود غرض، لالچی اور بے حس افراد کو دیکھتا ہے تو وہ ان سے دور ہونے کی کوشش کرتا ہے۔ جس سے یہ کیفیت پیدا ہو جاتی ہے کہ وہ بھری دنیا میں تنہا رہ جاتا ہے۔ حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ اور امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کی مثالیں ہمارے سامنے ہیں۔ جنھیں حق گوئی کی بنیاد پر جلاوطن ہونا پڑا۔ احمد ندیم قاسمی کا موقف یہ ہے جس طرح آگ اور پانی اکٹھے نہیں رہ سکتے۔ جس طرح مثبت اور منفی قوتیں جمع نہیں ہو سکتیں کیوں کہ ایسے موقع پر لوگ اجتماعی سطح پر انسانیت سے عاری ہو چکے ہیں اور اگر میں تنہا

www.pakcity.org www.pakcity.org

www.pakcity.org www.pakcity.org www.pakcity.org

ہوگیا ہوں تو اس میں حیرت کی کوئی بات نہیں ہے۔

؎ دونوں کا اک جُدا ہی مطلب ہے
یہ کہے روز، وہ کہے شب ہے

(میر تقی میرؔ)

احمد ندیم قاسمی کا موقف یہ ہے کہ اگر میں محبوب سے جُدائی کی وجہ سے تنہا رہ گیا ہوں تو اس میں کوئی حیرت کی بات نہیں ہے کیوں کہ جس طرح آگ اور پانی اکٹھے نہیں ہو سکتے اسی طرح میرا اور محبوب کا اکٹھا ہونا بھی ممکن نہیں۔ اگر آگ سے مراد عاشق اور پانی سے مراد محبوب لیا جائے تو عاشق کے اندر عشق کے جذبات جوش، جنون اور ولولہ آگ کی طرح بھڑک رہے ہوتے ہیں جبکہ محبوب کا دل عشق کے جذبات سے عاری ہوتا ہے اور وہ عام طور پر بے نیازی، بے رُخی اور بیزاری سے کام لیتا ہے۔ یوں عاشق آگ اور محبوب پانی ہے۔

؎ ہم ہیں مشتاق اور وہ بیزار
یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے

(مرزا غالبؔ)

؎ لپٹے جاتے ہیں ہم اُن سے، ہم سے ہیں وہ بھاگتے
اس طرف سے ہے نیاز اور اُس طرف سے ناز ہے

(آتشؔ)

اگر آگ سے مراد محبوب اور پانی سے مراد عاشق لیا جائے تو محبوب اپنے رویے، مزاج اور عادتوں میں آگ کی طرح بھڑکتا رہتا ہے اور اس کے برعکس عاشق پانی کی طرح ٹھنڈے مزاج، رویے اور عادتوں کا حامل ہوتا ہے۔ یعنی محبوب اور عاشق کے مزاج میں بہت فرق ہوتا ہے۔ اس لیے ان دونوں کا اکٹھے ہونا ممکن نہیں ہوتا۔ داغؔ دہلوی نے یہی صورتِ حال کچھ اس طرح بیان کی ہے۔

؎ میرا جدا مزاج ہے، اُن کا جُدا مزاج
پھر کس طرح سے ایک ہو اچھا بُرا مزاج

؎ دن رات کا فرق ہے تمہارے مزاج میں
دن کو جُدا مزاج تو شب کو جُدا مزاج

شعر نمبر 2:

ایک نعمت بھی یہی، ایک قیامت بھی یہی
روح کا جاگنا اور آنکھ کا بینا ہونا

تشریح: احمد شاہ المعروف احمد ندیم قاسمی اردو کے مشہور شاعر اور نثر نگار تھے۔ نکتہ آفرینی اور آفاقیت ان کی شاعری کا خاصہ ہے۔ غمِ عشق غمِ زمانہ اور آفاقی موضوعات پر مبنی ندیم کے اشعار زندگی کی حقیقتوں کے ترجمان بھی ہیں اور الجھنوں کے عکاس بھی۔

زیرِ تشریح شعر میں ندیم کہتے ہیں کہ ”روح کا جاگنا اور آنکھ کا بینا ہونا ایک نعمت بھی ہے اور ایک قیامت بھی۔“

اللہ تعالیٰ نے ہر انسان میں تلاش و جستجو کا جذبہ رکھا ہے۔ انسان خدا شناسی، خود شناسی، دیگر شناسی اور جہاں شناسی کے مراحل طے کرتا

www.pakcity.org www.pakcity.org

www.pakcity.org www.pakcity.org www.pakcity.org

ہے۔انسان جس معاشرے میں زندگی بسر کرتا ہے اس کے بارے میں بھی اس کو شعور اور آگہی حاصل ہوتی ہے۔ اسی شعور اور آگہی کو ''روح کا جاگنا'' قرار دیا گیا ہے۔اسی طرح ہر انسان کی دو طرح کی آنکھیں ہوتی ہیں۔ایک وہ جس سے وہ دیکھتا ہے اور ایک وہ جو اُس کے دل کی آنکھ ہے۔انسان کی دل کی آنکھ کھلی ہو تو اُسے ''آنکھ کا بینا ہونا'' کہا جاتا ہے۔یہ نعمت ہر ایک کو حاصل نہیں ہوتی۔ابنِ انشا کا کہنا ہے۔

حسن سب کو خدا نہیں دیتا
ہر کسی کی نظر نہیں ہوتی

بقول اقبال رحمۃ اللہ علیہ

دلِ بینا بھی کر خدا سے طلب
آنکھ کا نور دل کا نور نہیں

یہ شعور و آگہی اور آنکھ کا بینا ہونا اس اعتبار سے تو ایک نعمت ہے کہ انسان کو اپنے وجود کے تعین کرنے میں، کسی کام کے بارے میں کوئی فیصلہ کرنے میں یا کوئی بھی قدم اٹھانے میں بڑی آسانی رہتی ہے کہ ہر چیز کی پوشیدہ حقیقتیں اُس کے پیشِ نظر ہوتی ہیں۔یہ دونوں صفات انسان کو بُرے راستے سے باز رکھتی ہیں اور اُسے اچھائیوں پر آمادہ کرتی ہیں۔یوں یہ دونوں صفات اللہ کی ایک نعمت ہیں۔

چشمِ بینا بھی عطا کی، دلِ آگہ بھی دیا
مرے اللہ نے مجھ پر کیے احسان کیا کیا

(آتش)

لیکن جب معاشرہ مختلف مسائل کا شکار ہو، لوگ مختلف طبقوں میں بٹے ہوئے ہوں ان کے درمیان رنگ و نسل کے اختلافات، لسانی تضادات، مذہبی اختلافات موجود ہوں معاشرے میں غربت، جہالت اور ناانصافی کا دور دورہ ہو۔ان سب کے بارے میں جانتے ہوئے جب انسان اس صورت حال کو بدل نہ سکے تو یہی شعور و آگہی اور دل کی آنکھ کی بینائی قیامت بن جاتی ہیں۔ایسا انسان معاشرے میں ناانصافی، غربت، جہالت، لوگوں کے مسائل دیکھ کر دل ہی دل میں کُڑھتا ہے، جلتا ہے لیکن وہ بے بس ہوتا ہے یوں "روح کا جاگنا" اور "آنکھ کا بینا ہونا" انسان کے لیے تکلیف اور اذیت کا باعث بن جاتا ہے۔اسی لیے کہا جاتا ہے کہ لاعلمی بہت بڑی نعمت ہے۔احمد ندیم قاسمی روح کی بیداری اور آنکھ کی بینائی کو ایک قیامت قرار دے کر دراصل ہمیں زمینی حقائق کی طرف متوجہ کرتے ہیں کہ جس معاشرے میں ہم جی رہے ہیں یہاں پر ہر اس شخص کے لیے جو زندگی کا شعور رکھتا ہو جینا بڑا مشکل ہے۔

خوابِ غفلت کے دور میں حسرتؔ
دلِ بیدار کا خُدا حافظ

(حسرت موہانی)

شعر نمبر 3:

جو بُرائی تھی میرے نام سے منسوب ہوئی
دوستو! کتنا بُرا تھا مرا اچھا ہونا

تشریح: احمد شاہ المعروف احمد ندیم قاسمی اردو کے مشہور شاعر اور نثر نگار تھے۔نکتہ آفرینی اور آفاقیت ان کی شاعری کا خاصہ ہے۔غمِ عشق غمِ زمانہ اور آفاقی موضوعات پر مبنی ندیم کے اشعار زندگی کی حقیقتوں کے ترجمان بھی ہیں اور الجھنوں کے عکاس بھی۔

www.pakcity.org www.pakcity.org

www.pakcity.org www.pakcity.org www.pakcity.org

زیرِ تشریح شعر میں ندیم کہتے ہیں کہ ''میرا مثبت رویہ میرے لیے اتنا نقصان دہ ثابت ہوا کہ ہر برائی میرے نام سے ساتھ جوڑ دی گئی۔'' اچھائی اور برائی کے معیار ہر زمانے میں اور ہر معاشرے میں مختلف رہے ہیں۔لیکن کچھ قدریں ایسی ہیں جنھیں ماضی قدیم سے لے کر آج تک اچھا سمجھا جاتا ہے۔ان میں سے دوسروں کی مدد کرنا، دوسروں سے ہمدردی رکھنا، عدل وانصاف پر قائم رہنا، سچ بولنا، کسی کا حق غصب نہ کرنا یہ ساری باتیں ''حمورابی'' کے دستور سے لے کر آج کے زمانے تک پسندیدہ رہی ہیں۔ اس کے برعکس قتل و غارت، چوری، جھوٹ، لاقانونیت، خودغرضی، مطلب پرستی جیسے رویئے ہمیشہ سے ناپسندیدہ رہے ہیں۔لیکن بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ معاشرہ اجتماعی سطح پر بدعنوان ہو جاتا ہے اور ہر طرف برائی کا دور دورا ہوتا ہے۔ایسے معاشرے میں جب کوئی شخص اچھائی کے راستے پر چلتا ہے تو اُسے برا سمجھا جاتا ہے اور اس کے برعکس بُروں کو اچھا سمجھا جاتا ہے۔احمد ندیم قاسمی نے اپنے ایک اور شعر میں اسی معاشرتی رویے کو کچھ یوں بیان کیا ہے:

کوئی کہتا ہی نہیں بُروں کو بُرا
کتنا اچھا رہا بُرا ہونا

آتش کا کہنا ہے:

چلی ہے ایسی زمانے میں کچھ ہوا اُلٹی
کہ سیدھی بات سمجھتے ہیں آشنا اُلٹی

کوئی بھی معاشرہ جن چیزوں سے مرکب ہوتا ہے ان میں وہاں کے جغرافیائی حالات، وہاں کے وسائلِ پیداوار، رسم و رواج اور اجتماعی نظامِ فکر شامل ہے۔ ہر وہ عمل جو کسی معاشرے کے اجتماعی نظامِ فکر کے خلاف ہو، برائی کے زمرے میں شامل ہوتا ہے۔اسی طرح ہر وہ عمل جو اجتماعی نظامِ فکر میں پسندیدہ سمجھا جائے وہ اچھائی میں شمار ہوتا ہے۔لیکن جب معاشرہ اجتماعی سطح پر بگڑ جاتا ہے تو اچھائی اور بُرائی کی کسوٹی بدل جاتی ہے۔ اچھوں کو بُرا اور بُروں کو اچھا سمجھا جاتا ہے۔احمد ندیم قاسمی بھی ایسے ہی معاشرے کی تصویر کھینچ رہے ہیں جہاں راست گو اور سچے انسان کو بدنام اور رسوا کیا جاتا ہے اور اُس کی راست گوئی اور سچائی رسوائی کی وجہ بنتی ہے۔

ہم نہ کہتے تھے حالیؔ چُپ رہو
راست گوئی میں ہے رُسوائی بہت

انسانی تاریخ میں ایسے بے شمار افراد موجود ہیں جنھوں نے جب حق اور صداقت کی آواز بلند کی تو ان پر مختلف الزامات لگا کر ان کو برا ثابت کرنے کی کوشش کی گئی۔حضرت محمد رَسُولُ اللهِ خَاتَمُ النَّبِيِّينَ ﷺ نے جب بُرے معاشرے میں حق کی صدا بلند کی تو آپ ﷺ کو شاعر، مجنوں، جھوٹا، شرارتی جیسے کئی بُرے نام دے کر بدنام و رسوا کرنے کی کوشش کی گئی۔حق اور صداقت کی آواز بلند کرنے والے چاہے مختلف انبیا کرام علیہم السلام ہوں، امام حسین رضی اللہ عنہ ہوں، سقراط ہو، فیض احمد فیضؔ ہو یا حبیب جالب، اُن پر عام طور پر مختلف الزامات لگائے جاتے رہے ہیں اور اُن کو برا ثابت کرنے کی کوشش کی جاتی رہی ہے۔
حبیب جالبؔ کا کہنا ہے:

ایک ہمیں آوارہ کہنا، کوئی بڑا الزام نہیں
دنیا والے، دل والوں کو اور بہت کچھ کہتے ہیں

شعر نمبر 4:

قعرِ دریا میں بھی آ نکلے گی، سورج کی کرن
مجھ کو آتا نہیں محروم تمنا ہونا

www.pakcity.org www.pakcity.org www.pakcity.org

تشریح: احمد شاہ المعروف احمد ندیم قاسمی اردو کے مشہور شاعر اور نثر نگار تھے۔ نکتہ آفرینی اور آفاقیت ان کی شاعری کا خاصہ ہے۔ غمِ عشق غمِ زمانہ اور آفاقی موضوعات پر مبنی ندیم کے اشعار زندگی کی حقیقتوں کے ترجمان بھی ہیں اور الجھنوں کے عکاس بھی۔

زیرِ تشریح شعر میں ندیم کہتے ہیں کہ ''سورج کی روشنی انتہائی گہرائی تک بھی پہنچتی ہے۔ اگر انسان پرامید رہے تو اس کی آرزو پوری ہونے کا قوی امکان ہوتا ہے۔''

زندگی کے بارے میں دو طرح کا رویہ موجود ہوتا ہے:

(i) رجائی نقطۂ نظر (ii) قنوطی یا مایوسانہ رویہ

وہ افراد جو حقیقتوں کا تاریک رخ دیکھتے ہیں۔ عام طور پر مایوسی کا شکار ہو جاتے ہیں اور اس مایوسی کے نتیجے میں وہ کوشش اور جدوجہد ترک کر دیتے ہیں اور اپنے آپ کو حالات کے دھارے کے سپرد کر دیتے ہیں۔ اس کے برعکس وہ افراد جو زندگی کے بارے میں امید افزا نقطۂ نظر رکھتے ہیں۔ وہ مایوسی کو کفر سمجھتے ہوئے زندگی کی تاریکیوں میں بھی پُرامید رہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے مایوسی کو ناپسند کرتے ہوئے انسان کو مایوسی سے منع فرمایا ہے۔ ارشادِ ربانی ہے:

''اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہو۔''

انسان مختلف حالات سے دوچار ہوتا ہے۔ زندگی میں کبھی دھوپ ہوتی ہے کبھی چھاؤں، کبھی مشکلات، کبھی پریشانیاں، کبھی نشیب و فراز لیکن وہی افراد زندگی میں آگے بڑھتے ہیں جو مشکل سے مشکل وقت میں بھی ثابت قدمی کا مظاہرہ کریں اور یہ ثابت قدمی اسی وقت دکھائی جا سکتی ہے جب انسان زندگی کے بارے میں پرامید ہوتا ہے۔ جب اسے یہ توقع ہوتی ہے کہ جو تمنا، جو خواہش، جو نصب العین اس کے پیشِ نظر موجود ہے وہ اس کو ضرور حاصل کر لے گا اور اللہ تعالیٰ کا بھی انسان سے یہ وعدہ ہے کہ ''انسان کو وہی کچھ ملتا ہے جس کے لیے وہ کوشش کرتا ہے۔'' انسان کو غموں اور پریشانیوں میں پُرامید رہنا چاہیے۔

؎ زخم بھر جائے گا، غم نہ کر غم نہ کر
دِن نکل آئے گا، غم نہ کر غم نہ کر

(فیض احمد فیض)

شاعری میں ''قعرِ دریا'' مشکلات اور بُرے حالات کی علامت ہے۔ اسی طرح ''سورج کی کرن'' اچھے حالات اور بہتری کی علامت ہے۔ چناں چہ احمد ندیم قاسمی کا موقف یہ ہے کہ مشکل حالات میں بھی انسان کو اُمید کا دامن نہیں چھوڑنا چاہیے۔ قدرت کا یہ اصول ہے کہ ''ہر تکلیف کے بعد آسانی ہے۔'' جیسے اچھے حالات ہمیشہ نہیں رہتے ویسے ہی بُرے حالات بھی ہمیشہ نہیں رہتے۔ غموں کی شام کے بعد عید کی صبح اور رات کی تاریکیوں کے بعد سورج کی کرن کا نکلنا ایک آفاقی حقیقت ہے۔ اقبال رحمۃ اللہ علیہ نے علامتی انداز میں یہی تصور کچھ یوں پیش کیا ہے:

؎ شامِ غم، لیکن خبر دیتی ہے صبحِ عید کی
ظلمتِ شب میں نظر آئی کرن اُمید کی

مختصر یہ کہ احمد ندیم قاسمی کا موقف یہ ہے کہ انسان کی زندگی میں مشکلات اور تکلیفوں کا آنا ایک فطری عمل ہے۔ ایسے میں انسان کو مایوس نہیں ہونا چاہیے بلکہ حالات کی بہتری کے لیے پُراُمید ہونا چاہیے۔ کیوں کہ تکلیف کے بعد آسانی اور بُرے حالات کے بعد اچھے حالات ہوتے ہیں۔ رات کی سنگینیوں کے بعد صبح کی رنگینیاں ہوتی ہیں۔ اسی لیے انسان کو مشکلات کے اندھیروں میں اُمید کی کرن سے مایوس نہیں ہونا چاہیے۔

؎ رات جتنی بھی سنگین ہوگی
صبح اتنی ہی رنگین ہوگی

www.pakcity.org www.pakcity.org

www.pakcity.org www.pakcity.org www.pakcity.org

کچھ اور بڑھ گئے اندھیرے تو کیا ہوا
مایوس تو نہیں ہیں طلوعِ سحر سے ہم

(ساحرلدھیانوی)

شعرنمبر5:

شاعری روزِ ازل سے ہوئی تخلیق، ندیمؔ
شعر سے کم نہیں، انسان کا پیدا ہونا

مفہوم:

شاعری لازمۂ حیات ہے۔ یہ کائنات کے پہلے روز سے موجود ہے اور خود انسان کی تخلیق کسی شعر سے کم نہیں کہ انسان بھی اسی طرح موزوں اور متناسب مخلوق ہے جس طرح موزونیت شعر کا خاصہ ہے۔

☆☆☆☆☆

www.pakcity.org
EDUCATION
pakcity.org

www.pakcity.org www.pakcity.org

www.pakcity.org www.pakcity.org www.pakcity.org

احمد ندیم قاسمی (غزل نمبر 2)

شعر نمبر 1: (بورڈ 2010-2009)

اب تو کچھ اور ہی، اعجاز دکھایا جائے
شام کے بعد بھی سورج، نہ بجھایا جائے

تشریح: احمد شاہ المعروف احمد ندیم قاسمی اردو کے مشہور شاعر اور نثر نگار تھے۔ نکتہ آفرینی اور آفاقیت ان کی شاعری کا خاصہ ہے۔ غمِ عشق غمِ زمانہ اور آفاقی موضوعات پر مبنی ندیم کے اشعار زندگی کی حقیقتوں کے ترجمان بھی ہیں اور الجھنوں کے عکاس بھی۔

زیرِ تشریح شعر میں ندیم کہتے ہیں کہ ''کچھ ایسی کوشش ہونی چاہیے کہ شام ہونے کے بعد بھی روشنی برقرار رہے۔''

سورج، زندگی، توانائی اور روشنی کا مظہر ہے اور یہی چیزیں زندگی کی سرگرمیوں کو برقرار رکھنے کی ضامن بھی ہیں۔ سورج کا ڈوبنا اور تاریکی کا چھا جانا زندگی کی سرگرمیوں کے معطل ہونے کا نام ہے۔ احمد ندیم قاسمی کا موقف یہ ہے کہ زندگی ایک تسلسل کا نام ہے اور یہ تسلسل اسی وقت برقرار رہ سکتا ہے جب دن اور رات کا امتیاز یا حد بندی ختم کر دی جائے۔ شاعری میں سورج نیکی، بھلائی، عدل و انصاف اور مساوات کی علامت ہے۔ اس کے برعکس رات یا ظلمت ناانصافی، جبر، ظلم، جہالت اور غربت و افلاس کی علامت ہے۔ ترقی پسند شاعری میں رات کے اس اندھیرے کو دور کرنے کی خواہش اور ''سورج، صبح، اُجالے'' کی تلاش کی ہمیں مختلف شاعروں کے ہاں نظر آتی ہے۔ حبیب جالب کا کہنا ہے۔

؎ اپنی تو اُجالے کو ترستی ہیں نگاہیں
سورج کہاں نکلا ہے؟ کہاں صبح ہوئی ہے؟

احمد ندیم قاسمی کا موقف یہ ہے کہ اب کسی بھی صورت میں معاشرہ اندھیرے کا شکار نہیں ہونا چاہیے۔ وہ ساری قوتیں جو جبر کی بنیاد پر، لالچ کی بنیاد پر لوگوں کا استحصال کر رہی ہیں۔ انھیں ہر قیمت پر مٹا دینا چاہیے۔ اس کے بغیر معاشرے کی بہتری کا کوئی امکان نہیں ہے۔ اس جدوجہد میں چاہے جان رہے یا چلی جائے اس کی پرواہ نہیں لیکن کسی بھی صورت میں اب سورج کو بجھنے نہ دیا جائے۔ احمد ندیم قاسمی نے اپنے ایک اور شعر میں اسی خواہش کا اظہار کچھ یوں کیا ہے:

؎ میری ضد کون کرے گا پوری
شام کو صبح کا تارا چاہوں

آج کے انسان نے چاند پر قدم رکھ لیا ہے، ہواؤں میں اُڑنا سیکھ لیا ہے، بڑی بڑی عمارتیں بنالی ہیں، انسان مہینوں کا سفر گھنٹوں میں طے کرنے لگا ہے، دنیا کے ایک کونے سے دوسرے کونے میں لمحے بھر میں پیغام رسانی کرنے لگا ہے۔ غرض آج کے انسان نے کئی ایسی ترقیاں حاصل کی ہیں جو قدیم دور کے انسان کے لیے کسی معجزے سے کم نہیں تھیں۔ لیکن انسان یہ تمام تر ترقیاں حاصل کرنے کے باوجود جہالت، ظلم و ناانصافی، معاشرتی برائیوں اور معاشی استحصال جیسی تاریکیوں اور اندھیروں میں گھرا ہوا ہے۔ کاش کوئی ایسا معجزہ رونما ہو کہ انسان اپنی زندگی کی ان تاریکیوں سے نجات حاصل کر لے۔ اقبال رحمۃ اللہ علیہ کا کہنا ہے:

؎ ڈھونڈنے والا ستاروں کی گزر گاہوں کا
اپنے افکار کی دنیا میں سفر کر نہ سکا
جس نے سورج کی شعاعوں کو گرفتار کیا
زندگی کی شبِ تاریک سحر کر نہ سکا

www.pakcity.org www.pakcity.org

www.pakcity.org www.pakcity.org www.pakcity.org

شعر نمبر 2:

نئے انسان سے تعارف جو ہوا، تو بولا
میں ہوں سقراط، مجھے زہر پلایا جائے

تشریح: احمد شاہ المعروف احمد ندیم قاسمی اردو کے مشہور شاعر اور نثر نگار تھے۔ نکتہ آفرینی اور آفاقیت ان کی شاعری کا خاصہ ہے۔ غمِ عشق غمِ زمانہ اور آفاقی موضوعات پر مبنی ندیم کے اشعار زندگی کی حقیقتوں کے ترجمان بھی ہیں اور الجھنوں کے عکاس بھی۔

زیرِ تشریح شعر میں ندیم کہتے ہیں کہ ''آج کے انسان سے جب میرا تعارف ہوا تو اس نے یہ کہا کہ میری مثال سقراط کی مانند ہے بے شک مجھے بھی زہر کا پیالہ پلا دیا جائے۔''

سقراط یونان کی ریاست ایتھنز کا رہنے والا تھا۔ یونانی فلسفے میں سقراط نے استخراجی طریقۂ کار متعارف کرایا۔ اس نے اپنے طریقۂ کار کی بنیاد پر اپنا وہ شہرۂ آفاق بیان دیا کہ ''میں بس اتنا جانتا ہوں کہ میں کچھ نہیں جانتا۔'' سقراط اپنی بے باکی کے حوالے سے ضرب المثل کا درجہ رکھتا تھا اور اسی لیے اسے سزائے موت بھی دی گئی۔ سقراط کے دور کا بادشاہ جسے موت کی سزا دیتا تھا اُسے زہر کا پیالہ پینا پڑتا تھا۔ جب سقراط کو موت کی سزا ہوئی تو اس کے شاگردوں نے کوشش کی کہ اسے قید خانے سے فرار کیا جائے۔ لیکن سقراط نے بھاگنے سے انکار کر دیا اور خوشی خوشی زہر کا پیالہ پینے کو تیار ہو گیا۔ احمد ندیم قاسمی کا موقف یہ ہے کہ آج کا انسان بھی سقراط کی طرح نڈر و بے باک ہے۔ نئے عہد کے انسان کو سقراط کی مانند قرار دینے کا مقصد یہ ہے کہ آج کا انسان حقیقت سے بھاگنے کا قائل نہیں اور حق گوئی کی خاطر اسے اگر اپنی جان بھی دینا پڑے تو وہ اس سے بھی گریز نہیں کرتا۔ ساحر لدھیانوی کا کہنا ہے:

ہم ہیں سقراط عہدِ نو کے، تشنہ لب ہی نہ مر جائیں یارو
زہر ہو یا مہِ آتشیں ہو، کوئی جامِ شہادت تو آئے

انسانی تاریخ سے یہ بات ثابت ہے کہ جب بھی کسی نے حق اور صداقت کی آواز بلند کی تو اُسے باطل قوتوں کی جانب سے کئی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا اور یہاں تک کہ اُسے اپنے نظریات کی پاداش میں زندگی سے بھی محروم ہونا پڑا۔ حق کی آواز بلند کرنے کی پاداش میں باطل قوتوں نے ابراہیم علیہ السلام کو آگ میں پھینکا، حضرت زکریا علیہ السلام کا بدن آرے سے دو ٹکڑے کر دیا، اُن کے بیٹے حضرت یحییٰ علیہ السلام کو ذبح کیا، حضرت امام حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور دیگر اہلِ بیت کو میدانِ کربلا میں شہید کیا اور منصور کو تختۂ دار پر لٹکا دیا۔ غرض تاریخ میں ایسی کئی مثالیں موجود ہیں کہ حق کی بات کرنے والوں کو بالآخر باطل قوتوں کے ہاتھوں تختہ دار تک پہنچنا پڑا۔ آتش کا کہنا ہے:

واقعہ منصور کا سن کر کھلا ہم پہ یہ راز
حق کہے سے آدمی ہوتا ہے قابل دار کے

احمد ندیم قاسمی کا تعلق ترقی پسند تحریک سے رہا۔ شاعری کے ساتھ ساتھ آپ صحافت سے بھی وابستہ رہے اور دوسرے کئی ترقی پسند دانش وروں کی طرح آپ کو بھی قید و بند کی صعوبتیں برداشت کرنا پڑیں۔ ہر وہ انسان جو حقیقت کا پورا ادراک رکھتا ہو، جسے اپنے موقف کی سچائی کا یقین ہو وہ بڑی سے بڑی مصیبت کا سامنا کرنے کے لیے تیار رہتا ہے۔ اپنے نظریے اور حق بات پر جان کی بازی لگانے سے گریز نہیں کرتا اور وہ ہر وقت اپنے موقف پر سر کٹوانے کے لیے تیار رہتا ہے۔ حبیب جالب کا کہنا ہے:

میں بھی منصور ہوں، میں بھی منصور ہوں
کاٹ دو میرا سر، کاٹ دو میرا سر

www.pakcity.org www.pakcity.org

www.pakcity.org www.pakcity.org www.pakcity.org

''شعر تلمیح کی مثال ہے۔''

شعر نمبر 3:

موت سے کس کو مفر ہے، مگر انسانوں کو
پہلے جینے کا سلیقہ، تو سکھایا جائے

تشریح: احمد شاہ المعروف احمد ندیم قاسمی اردو کے مشہور شاعر اور نثر نگار تھے۔ نکتہ آفرینی اور آفاقیت ان کی شاعری کا خاصہ ہے۔ غمِ عشق غمِ زمانہ اور آفاقی موضوعات پر مبنی ندیم کے اشعار زندگی کی حقیقتوں کے ترجمان بھی ہیں اور الجھنوں کے عکاس بھی۔

زیرِ تشریح شعر میں ندیم کہتے ہیں کہ ''موت سے بھاگنا ممکن نہیں۔ یہ ایسی سچائی ہے جسے جھٹلایا نہیں جا سکتا لیکن اصل بات یہ ہے کہ لوگوں کو جینے کا سلیقہ آنا چاہیے۔''

زندگی اور موت دو متضاد حقیقتیں ہیں۔ تحریر و تقریر میں عام طور پر موت جیسی اٹل حقیقت کا تذکرہ اور اس کی تیاری کا درس کثرت سے دیا جاتا ہے۔ لیکن اس کے برعکس زندگی جیسی اہم حقیقت کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ موت ایک اٹل حقیقت ہے اور ہر ذی روح کا آخری انجام یہی ہے کہ اُسے منوں مٹی تلے دفن ہونا ہے۔ موت ایک ایسی حقیقت ہے کہ چاہے مذہب ہو، چاہے ہمارا مشاہدہ اس حقیقت کو جھٹلایا نہیں جا سکتا۔ یہ وہ حقیقت ہے کہ جس سے فرار ممکن نہیں ہے۔ قرآن پاک میں صرف دو الفاظ میں انسانی بے بسی اور موت کے اس پہلو کا خوبصورت تذکرہ کیا ہے۔

ارشادِ ربانی ہے: این المفر○ ''جائے فرار کہاں ہے؟''

احمد ندیم قاسمی کا موقف یہ ہے کہ چوں کہ موت سے کوئی نہیں بھاگ سکتا اس لیے میں موت سے بحث نہیں کرتا۔ میرا کہنا تو یہ ہے کہ انسانوں کو موت سے پہلے آنے والی حقیقت یعنی زندگی گزارنے کا سلیقہ اور طریقہ سکھانا چاہیے۔ موت چوں کہ بعد میں ہے اس لیے اس کا تذکرہ بھی بعد میں ہو جائے گا۔ مگر فی الحال لوگ زندگی گزارنے کے سلیقہ سے محروم ہیں اس لیے ضرورت اس بات کی ہے کہ انسان کو پہلے زندگی گزارنے کا طریقہ سکھانا چاہیے۔ فراق کا کہنا ہے:

؎ جینا جو آ گیا تو اجل بھی حیات ہے
اور یوں تو عمرِ خضر بھی کیا؟ بے ثبات ہے

؎ رو رو کے موت مانگنے والوں کو
جینا نہیں آسکا تو مرنا کیا ہے؟

اللہ تعالیٰ نے زندگی اور موت کو امتحان قرار دیا۔ ارشادِ ربانی ہے: ''جس نے زندگی اور موت پیدا کی تا کہ تمھیں آزمائے۔'' زندگی ایک امتحان ہے۔ وہ امتحان جس کا بوجھ اُٹھانے سے پہاڑوں، زمینوں حتیٰ کہ آسمانوں نے بھی انکار دیا تھا۔ لہٰذا اصل چیز یہ ہے کہ زندگی کیسے گزاری جائے۔ دنیا کو آخرت کی کھیتی کہا گیا ہے کہ انسان جو کچھ بوتا ہے آخرت میں اسی کا پھل اسے ملتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ایک لاکھ چوبیس ہزار پیغمبر اور آسمانی صحیفے اسی لیے نازل کیے کہ انسانوں کو زندگی گزارنے کا طریقہ سکھایا جائے بلکہ انسان کی تخلیق کے مقصد ہی میں اس کرہ ارض پر انسان کی زندگی گزارنے کے سلیقے کا تعین کر دیا گیا۔ انسان کو اپنا جانشین بنا کر بھیجنا اسی بات کا متقاضی ہے کہ انسان اس کرہ ارض پر اس طرح زندگی گزارے جس طرح خدا چاہتا ہے۔ بے شمار دانش ور اپنے تجربات کی روشنی میں لوگوں کو زندگی گزارنے کا سلیقہ سکھاتے رہے۔ اکبر الہ آبادی نے موت اور جینے کو اپنے ایک شعر میں یوں بیان کیا ہے:

www.pakcity.org www.pakcity.org

www.pakcity.org www.pakcity.org www.pakcity.org

بے وقوفی ہے تعجب موت پر
عقل تو جینے ہی پر حیراں ہے
حکم ہے سچ بھی قرینے سے کہا جائے، ندیمؔ
زخم کو زخم نہیں، پھول بتایا جائے

مفہوم: ہم سے توقع کی جاتی ہے کہ ہم زندگی کی تلخیوں کو خوش نما بنا کر پیش کریں جو کم از کم ہم سے نہیں ہو سکتا۔

www.pakcity.org www.pakcity.org